دارالعلوم دیوبند

ادبی شناخت نامہ

حقانی القاسمی

ناشر: آل انڈیا تنظیم علماء حق
25/Q، الصدر روڈ، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی-25 ٹیلی فیکس: 011-26985943

دارالعلوم دیوبند

ادبی شناخت نامہ

(جلد اول)

حقانی القاسمی

آل انڈیا تنظیم علماء حق رجسٹرڈ
Q-25 الصمد روڈ، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025

نام کتاب	دارالعلوم دیوبند — ادبی شناخت نامہ
مصنف	حقانی القاسمی
پتہ	• الخلیل میموریل لائبریری، یتیم خانہ کمپلیکس، اَرریا۔۸۵۴۳۱۱ • معرفت عابدانور، D-64، فلیٹ نمبر۔۱۰، ابوالفضل انکلیو جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵
موسم اشاعت	مئی، ۲۰۰۶
تعداد	ایک ہزار
کمپوزنگ	محمد اکرام خاں
سرورق	ڈاکٹر صابر علی سیوانی
طابع	نیو پرنٹ سینٹر، دریا گنج، دہلی۔۲
زیر اہتمام	آل انڈیا تنظیم علماء حق، Q-25، الصدر روڈ، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی۔ ۲۵ ٹیلی فون: 26985943-(011)
قیمت	سو روپے (-/Rs.100)

تقسیم کار

- دارالکتاب، دیوبند
- بک کارنر، موتیہاری مارکٹ، مین روڈ، موتیہاری۔ ۸۴۵۴۰۱
- آزاد کتاب گھر، ساکچی بازار، جمشید پور (جھارکھنڈ)
- الکتاب یتیم خانہ کمپلیکس، اَرریا۔۸۵۴۳۱۱
- ادارہ نادی المصنفین، شاہی محلہ۔۱، کلنی ضلع بردوان۔۷۱۳۳۴۳

Darul Uloom Deoband: Adabi Shanakhat Nama 2006
by: Haqqani Al-Qasmi Rs.: 100/-

'اقرا' اور 'انار' کے
اُس درخت کے نام
جس کی عرفانی پتیوں کی خوشبو
پوری دنیا میں پھیل رہی ہے!

مولانا اعجاز عرفی قاسمی

نذر دارالعلوم دیوبند

مادر علم تیری قدس مآبی کے نثار
تونے بخشی ہے مجھے گلشن احمد کی بہار

جلوۂ منزل مقصود دیا ہے تونے
جذبہ قاسم و محمود دیا ہے تونے

تیری آغوش میں گزرے ہیں جولمحات حیات
ہیں وہی میرے لیے حاصل عنوانِ نجات

درس گاہوں میں میسر تھا جو اندازِ سکوں
عمر بھر یاد رہے گا وہ وفا کا مضموں

منطق و فقہ و فلسفہ کے سارے اسباق
بن گئے مصحف ادراک یقیں کے اوراق

دل کی گہرائی میں خاکہ ہے حسیں یادوں کا
درس شیریں ہمہ تن کیف وہ استاذوں کا

ذہن سے یہ در و دیوار نہ جائیں گے کبھی
روح کو خلد کی تصویر بنائیں گے سبھی

یہ دعا کر کہ تیرے نام کو روشن رکھیں
اپنے اسلاف کے ہر کام کو روشن رکھیں

علم سرمایہ دامان نظر بن جائے
زندگی دین کا عنوان سفر بن جائے

تاابد سلسلہ خیر ترا جاری ہو
مشغلہ میرا فقط حق کی طرف داری ہو

ایسے اوصاف ملیں جن پہ تجھے ناز رہے
تیرا اعجاز جہاں میں ترا اعجاز رہے

ترتیب

ادبی ثقافتی روایت

ادبی اُفق

جہانِ فکر و دانش

بنارس میں ایک دعا مانگی تھی...

دعا نے رختِ سفر باندھ لیا اور میں حقیر فقیر مسلمان اسی شہر میں مقیم، گنگا اشنان کر کے جمعہ کی نماز ادا کرتا رہا جس کی صبح کا آغاز کاشی وشوناتھ اور سنکٹ موچن مندر میں بھارت رتن استاد بسم اللہ خاں کی شہنائی سے ہوتا ہے۔

اسی شہر کو مسلمانوں سے خالی کرانے کے لیے انگریز حکمرانوں کو مٹھی بھر جنونی ہندوؤں نے تین کروڑ کی پیشکش کی تھی جب کہ اُدھر اہلِ ایماں کی سوچ شیخ علی حزیں کے شعر میں یوں ڈھل رہی تھی:

از بنارس نروم معبد عام است اینجا
ہر برہمن پسرے لچھمن و رام است اینجا

اور مرزا اسد اللہ خاں غالب ہندوؤں کے مقدس شہر کو 'فردوس معمور' کہہ کر اس کے تقدس کا چراغ دلوں میں یوں روشن کر رہے تھے:

تعالی اللہ بنارس چشم بددور
بہشت خرم و فردوس معمور

شیخ علی حزیں کو تو خواب میں حضرت امام حسینؓ نے کہا تھا کہ ''بنارس ہی میں مقیم رہو۔'' مگر میرے پاس تو خواب بھی نہیں تھے کہ غریبی انسان سے سارے خواب چھین لیتی ہے۔ پھر بھی میں پانچ برس تک بنارس میں شاہ طیب بناری کا مزار، ان کی خانقاہ شریعت آباد اور سارناتھ کے بودھی کھنڈرات میں سرِ دو روحانی و عرفانی کی جستجو کرتا رہا۔

میں نے وہاں نہ جانے کتنی راتیں جاگ کر گزاریں مگر ان راتوں میں میرے لیے صرف تاریکیاں تھیں جب کہ اورنگ زیب کے لیے اس ''شہرِ نجات'' کی ایک رات کشف کی رات ثابت ہوئی۔ گنیش کی ہلتی ہوئی مورتی میں انہوں نے وہ سیڑھیاں دیکھ لیں جو بہت نیچے تک جارہی تھیں جہاں کچھ کی مہارانی کی ساڑیاں اتاری گئی تھیں اور ان کے بدن کے زیورات غائب کردیئے گئے تھے۔ اور شاید ان کے ساتھ ... مجھے پانچ برسوں تک نہ تو وہاں کبیر کی سیڑھیاں نظر آئیں نہ کبھی راما نند رامانج سے ملاقات ہوئی اور نہ پتن جلی کا پتہ چلا۔ نہ شہر کی 'روح' کا سراغ ملا۔

[میں روشنی کے شہر کاشی

Older than history, older than
tradition, older even than legend.

(Mark Twain)

کی تاریکیوں میں ہی کھو یا رہا۔]

میں جب براہِ بریلی، دیوبند پہنچا تو میری دعا کو چار برس بیت چکے تھے۔
میں دعا کے ہجر میں بے اماں اور دعا میرے وصال کے لیے مضطرب تھی۔

وہ انگریزی کا ۱۹۸۴ء کا سنہ تھا اور عربی کا ماہِ شوال۔ رم جھم بارش ہورہی تھی۔ بابِ قاسم پہ میرے پاؤں میں لرزش طاری ہوگئی۔ میرے قدم وہیں ٹھہر سے گئے اور آنکھیں بابِ قاسم پہ کندہ جلی عبارت میں مخفی مفہوم تلاش کرتی رہیں۔ چند ساعتوں کے بعد دارالعلوم دیوبند کے رواق خالد کے ایک حجرے میں تھا۔ میں کب کیسے پہنچا، کچھ بھی یاد نہیں!

سامان رکھتے ہی بے کلی بڑھنے لگی، دیدار کی تمنا نے بے تاب کردیا۔ نودرے کے قریب آیا تو نودرے پہ نگاہ جم سی گئی اور نواحِ دل و جاں سے نکلتی آوازیں ساعت میں گشت کرنے لگیں۔

میں نودرے کی اسراریت میں گم سوچتا رہا اور وہ لکیریں تلاش کرتا رہا، جو مولانا رفیع الدین

(۱۸۳۲-۱۸۹۰ء) کے خواب میں روشن ہوئی تھیں۔ رسالت مآب کے مقدس ہاتھوں سے کھینچی ہوئی ان لکیروں کی تجسیم دیکھ کر آنکھیں عقیدت سے جھک گئیں، حضورؐ کے بتائے ہوئے نقشہ کی تعمیری ساخت اور صورت پہ محو حیرت تھا کہ ایک اور حیرت جڑ گئی کہ اس کا سنگ بنیاد بھی ایک عاشق رسول محدث جلیل مولانا احمد علی سہارن پوری نے رکھا تھا۔

[نودرے کی یہ عمارت ہمیشہ جاگتی رہتی ہے۔ اس کی
آنکھوں میں کبھی غنودگی طاری نہیں ہوتی۔]

حیرت کے ساتھ میری تشنگی بڑھنے لگی۔ نودرے کے کنوئیں سے دو گھونٹ پانی پیا، ایسا پانی کسی کنوئیں، ندی، نہر میں پینا نصیب نہ ہوا تھا۔ اس پانی کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ اس لیے بڑی عقیدت کے ساتھ پیا، پانی کا ذائقہ پورے بدن میں پھیلنے لگا اور پورا وجود ایک نئے ذائقے سے روشناس ہونے لگا—

[یہ پانی تھا یا کوئی رمز سریانی— میری فہم سے آج
تک باہر ہے۔]

کہتے ہیں کہ یہ دودھ کا کنواں ہے اور حضور یہاں پیالے سے دودھ تقسیم فرما رہے ہیں۔

دیو بند کی مٹی، موسم سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ بدن کو موسم راس نہیں آیا۔ بخار سے بدن تپنے لگا اور پھر اسی کیفیت میں امتحان کی گھڑی آن پہنچی۔ میری جان سخت مشکل میں پھر کسی نے یہ مژدہ سنایا کہ یہ آزمائش بہت بڑی کامیابی کی تمہید ہے تو بدن کے ساتھ میرے ذہن کی دنیا بھی بدل گئی۔

دیو بند میں شاید میرا ساتواں دن تھا۔ اس دن تین سو تیرہ کی فہرست میں ایک نام میرا بھی تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا مگر دعا نے میرے شک کے سارے زہر کو پی لیا۔ میں نے دیکھا کہ دعا کے ہونٹوں پر خشکی طاری تھی، اگلے دن سے دیو بند میں میرے لئے ''خشک نان'' کا انتظام ہو گیا تھا۔

دیو بند کے شام و سحر کی رعنائی سے شناسائی بڑھنے لگی تو دل و جان نئی کیفیتوں سے آشنا ہونے لگے۔ مجھے ڈر لگنے لگا کہ کہیں دھیرے دھیرے میرا بنارس غائب نہ ہو جائے، مگر اسطور اور استعارہ کا امتزاج بنارس میری آتما میں لین ہو گیا تھا اور میرے حال کے ساتھ میرا ماضی بھی زندہ تھا۔

دیو بند کے زمانۂ قیام میں نفرتیں، محبتیں، شفقتیں، ملامتیں سبھی ساتھ ساتھ ملیں۔ مگر اس دل زمین اور دامن گیر مٹی سے بچھڑنے کا بڑا دکھ ہوا۔ جس کی آگ اب بھی دل کو جلاتی ہے۔

دیوبند کے وہ دکھ بھرے دن تھے۔ مگر مجھے اذیت کا کبھی احساس نہیں ہوا۔ وہاں کی فضا اور موسم میں عجب طرح کی سرشاری تھی کہ مجھ جیسے مضطرب، ملتہب اور بے چین روح کو بھی راحت نصیب تھی۔

دیوبند کی بزم سے نکلا تو پریشاں نکلا، مگر دیوبند کی تھپکیاں ہمیشہ محبتوں کا احساس دلاتی رہیں اور نسبتِ قاسمی نے تو میرے نصیب ہی بدل دیئے۔

[علی گڑھ میں بھی دیوبند مجھ سے جدا نہیں ہوا۔
دیوبند دل میں اسی طرح جاگزیں رہا جیسے میرے
خواب، جیسے میرے سپنے، جیسے میری یادیں، جیسے میرا
ماضی، جیسے میری ماں۔]

علی گڑھ کے اپنے الف لیلوی کمرہ 69 میں بیٹھا ہوا سوچتا تو لگتا کہ میں اب بھی اسی قصبہ میں ہوں۔ میرے خوابوں کا نگر، دیوبند۔ صاحبانِ فضل و کمال کا شہر، علم و عرفان کا شہر، جہاں کتابوں کی روشنی، ذہنوں کی ظلمتوں کو نگل جاتی ہے جہاں چھتہ مسجد میں انار کا درخت ایستادہ تھا، جس کے ایک ایک پتے کو صد سالہ جشن کے زائرین نے نوچ لیا تھا۔ وہ درخت ہرا بھرا لگ رہا تھا۔

[یہ درخت دراصل نمو، تسلسل اور توسیع کی طرف
ایک روحانی اشارہ تھا۔]

بھلا ایسا روحانی شجر جس کی جڑوں میں بزرگوں کی خوشبوئیں بسی ہوئی ہوں، کیسے مرجھا سکتا ہے۔ یہ درخت ہمیشہ ہرا بھرا رہے گا کہ اس درخت کا رشتہ اس سبز گنبد سے ہے جہاں ہمارے صاحب مازاغ حضور پرنور قیام فرما ہیں۔

بزرگوں سے سنا تھا کہ اسی درخت کی چھاؤں تلے، دیوبند کا 'مدرسہ اسلامی عربی' قائم ہوا تھا جس کے پہلے استاد ملا محمود اور شاگرد بریلی کے محمود حسن تھے جو بعد میں شیخ الہند کے نام سے مشہور ہوئے اور ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ریشمی رومال تحریک ان کی شناخت اور شہرت کا حوالہ بن گئی۔

علی گڑھ میں مجھے دیوبند کے درد کا احساس ہوا۔ اکثر رات کی تنہائیوں میں یہی سوچتا رہتا کہ کتنا خلوص اور قوم و ملت کا درد بھرا ہوگا، ان لوگوں کے سینے میں جنہوں نے ملت اسلامیہ کے زخموں کا مداوا کرنے کے لیے مدرسہ قائم کیا ہوگا۔ کتنی مشقتیں اٹھائی ہوں گی؟ کتنی صعوبتوں سے گزرے ہوں گے وہ لوگ؟ حاجی محمد عابد، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولوی مہتاب علی، مولوی ذوالفقار

علی، مولوی فضل الرحمٰن، منشی فضل حق، شیخ نہال کی صورتیں نگاہوں میں روشن ہوگئیں کہ یہ سب ایک ہی سلسلہ درد سے جڑی ہوئی ہستیاں تھیں۔ جنہوں نے کم عمری میں ایک بڑی مثال قائم کردی۔

[صرف ۳۴ سال عمر تھی مولانا قاسم نانوتوی کی اور ۳۲ سال کے تھے حاجی محمد عابد جب دیوبند میں عربی مدرسے کی تاسیس عمل میں آئی۔ جوانی میں ایسے بلند جذبہ کی مثال کم کم ہی ملتی ہے۔]

حاجی محمد عابد کے سفید رومال کی وہ جھولی جھلملانے لگی جس میں تین روپے خود ڈال کر حاجی صاحب، مولوی مہتاب علی کے پاس گئے۔ انہوں نے چھ روپے عنایت کیئے، پھر مولوی فضل الرحمٰن نے بارہ روپے دیئے۔ منشی فضل حق نے چھ روپے، مولوی ذوالفقار علی اور سید ذوالفقار علی ثانی نے بارہ بارہ روپے دیئے۔ شام تک تین سو روپے جمع ہوگئے اور انہیں تین سو روپوں سے دیوبند کے اصحاب صفہ کا سفر شروع ہوا۔ اصول ہشتگانہ کی الہامی روشنی میں غیر مستقل آمدنی کی وجہ سے اس ادارے کا مستقل سفر جاری وساری ہے۔

[ایسے گوہر نایاب، نابغۂ روزگار لوگ اب کہاں، سب خفتگان خاک ہوئے۔ بس ان کی کتابیں اور قبریں ہی رہ گئی ہیں۔]

میرے قدم رفتہ رفتہ مزار قاسمی کی طرف بڑھنے لگے۔ پانچ قدم کی دوری پہ ہی ہیبت طاری ہوگئی، کیسا جاہ وجلال تھا اس خاموشی میں، کتنی تمکنت تھی اس سکوت میں... بے ساختہ میرے ہاتھ بھی دعاؤں کے لیے اٹھ گئے، فاتحہ پڑھی اور پھر نظر اٹھا کر دیکھا تو ہر قبر پہ ایک کتبہ آویزاں... آنکھوں سے اوجھل ہوئے انہیں صدیاں گزر گئیں مگر دلوں میں یوں زندہ ہیں جیسے صبح صادق سو رہی ہے رات کی آغوش میں:

قبر کی ظلمت میں ہے ان آفتابوں کی چمک
جن کے دروازوں پہ رہتا تھا جبیں گستر فلک
مرنے والوں کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں
جس طرح تارے چمکتے ہیں اندھیری رات میں
—اقبال

مولانا محمد قاسم نانوتوی کی قبر دیکھ کر اقبال کا یہ شعر جگمگانے لگا:

اس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے
اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحب اسرار

اس کے قریب ہی مولانا محمود حسن اور مولانا حسین احمد مدنی قیام فرما ہیں اور آس پاس صلحاء امت کی آرام گاہ جن کی عظمتوں کے سامنے جبینیں جھک جاتی ہیں۔

میں اکثر اپنے اندھیرے کمرے میں ان اہل قبور کی کتابوں کی روشنیاں ڈھونڈ تا رہتا، ان کی کتابوں میں کتنی روشن عبارتیں تھیں — یہ سب عبارتیں ہمارے ذہنوں سے محو ہوتی جارہی ہیں اور ذہن میں اندھیرا پھیلتا جارہا ہے۔ ایسی ہی ایک اندھیری ساعت میں مجھ جیسے آشفتہ سر کے ذہن میں ایک خیال کوندا، کیا ان روشنیوں کو قید کیا جاسکتا ہے—؟

بس اسی رات کی صبح سے خیال کے نیزے سے اپنے ذہن کو لہولہان کرتا رہا۔ ذہن مکمل طور پر لہولہان ہو گیا مگر خیال، عمل میں نہ ڈھل سکا۔

کئی برس بیت گئے، اس دوران ذہن کی ترجیحات اور تقاضے بھی تبدیل ہو گئے۔ میرا برسوں پرانا خیال بھی منجمد ہونے لگا، پھر ایک دن یوں ہوا کہ قومی اخبارات میں دہشت گردی کی تصویریں چھپیں اور اس کا سلسلہ دیوبند سے جوڑ دیا گیا۔ میرا دل دہل گیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ دیوبند کے دو سالہ قیام میں جہاں صرف انسانیت اور اخلاقیات کی تعلیم دی گئی تھی، وہاں اب تعلیم و تربیت کا رخ بدل گیا ہے۔ دل پہ چوٹ سی لگی اور میرا پرانا درد جاگ اٹھا—

دیوبند اور دہشت گردی— دو متضاد چیزوں کا اتصال کیسے ممکن ہے؟ اس سانحے سے میرے ذہن کی زمین لرز گئی اور میں نے طے کرلیا کہ ذہن کا زاویہ بدلے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔ ہم اپنی تاریخ، تہذیب اور روایت سے کٹ کر عزت کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتے۔ ہمیں اپنی جڑوں کی طرف لوٹنا ہی ہوگا۔

[میرے دل میں اس مٹی کی محبت اور بڑھ گئی جس مٹی میں حضرت سید احمد شہید کو علم کی خوشبو محسوس ہوئی تھی۔]

پرانی تاریخ دستک دینے لگی۔ مشترکہ تہذیبی کردار کا حامل ایک چھوٹا سا قصبہ 'دیوی بن' ذہن کے افق پر قدیم قصباتی کلچر اور رفعت کی داستانیں سمیٹے ہوئے روشن ہونے لگا۔ جہاں کی تہذیبی سماجی ساخت میں انتشار و افتراق نہیں، بلکہ ہم آہنگی کا عنصر حاوی تھا اور جو اپنے Pluralist

paradigm کی وجہ سے بھی ممتاز تھا۔ سالار مسعود غازی کا مفتوحہ قلعہ نظروں کو 'نئی نوید' دینے لگا۔ خواجہ عثمان ہارونی کے مسترشد قاضی دانیال قطری کے قیام کی خوشبو بھی آنے لگی۔ ابن الجوزی کے ''تلمیذ التلمیذ'' شاہ علاء الدین جنگل باش کا ''مزار'' آنکھوں میں رقص کرنے لگا۔ سکندر لودھی کی ''مسجد قلعہ'' اکبر کی ''مسجد خانقاہ'' اورنگ زیب کی ''مسجد ابوالمعالی'' یہ ساری مسجدیں سینے میں منور ہونے لگیں اور نگاہ کو جمال نورانی عطا کرنے لگیں!

'دیوبند' میرے وجود میں اتر گیا تھا اور میں اس کی سانسوں سے اپنی سانسوں کا سلسلہ جوڑنے لگا—

جب میں دیوبند پر کتاب لکھنے کے لیے اپنے ذہن کو تیار کر رہا تھا تو میرے بعض احباب نے سرزنش کی کہ یہ پوری قوم تو قیلولہ میں ہے۔ ان پر اپنے وقت کا زیاں کیا ضروری ہے۔ ان کا اعتراض حق بجانب تھا۔

[میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں اور کوئی ضروری نہیں کہ ہر اعتراض کا جواب ہی دیا جائے۔]

سو میرے وہ احباب میری اس کتاب کو دیکھ کر نالاں یا ناراض بھی ہو سکتے ہیں کہ اچانک تحویل قبلہ کا یہ معجزہ کیسے رونما ہو گیا اور میری ملحدانہ ذہنیت کیسے تبدیل ہو گئی۔

[میں کبھی کلمہ سے منحرف نہیں ہوا، میری فکر کلمہ کی اساس پر استوار رہی، مگر جبر، حالات اور خوف نے اتنے خداؤں کو جنم دیا ہے کہ کسی ایک کی عبادت کرتا تو شرک لازم آتا۔ لوگ مومن نہ سمجھیں مجھے یہ منظور ہے مگر مجھے مشرک بننا قطعی گوارا نہیں۔ اس لیے میں اپنے خدائے وحدہ لاشریک لہ کے ساتھ خوش تھا۔]

میں ان یاران دل گرفتہ کو کیسے بتاؤں کہ عالمی تغیرات نے بڑے بڑے ملحدوں اور دہریوں کے نظریئے بدل دیئے ہیں اور آج کے عہد میں نظریئے کی تبدیلی اور پیراڈائم شفٹ کے بغیر زندہ رہنا مشکل ہے:

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفان مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

ہر فرد اپنی ثقافتی اور تہذیبی جڑوں کی طرف لوٹ رہا ہے اور روحانیت کی طرف مراجعت کا سفر جاری ہے۔ اِس لیے نظریئے کی تبدیلی حالات کا تقاضہ بھی ہے اور اِس میں کوئی شرمندگی یا ندامت کی بات بھی نہیں کہ آدمی اپنے مذہبی تہذیبی اور لسانی تشخص کے ساتھ زندہ رہے۔

[جو قومیں اپنے تشخص سے انحراف کرتی ہیں۔ ان
قوموں کے نشانات مٹ جاتے ہیں۔]

میری یہ کتاب اُس تہذیبی اور مذہبی تشخص کی طرف مراجعت ہے اور میں اس مراجعت سے مسرور ہوں۔ اس کی بنیاد پر میں رجعت پسند نہیں کہلا سکتا کہ دیوبند بنیادی طور پر رجعت پسندی کا سب سے بڑا مخالف ہے اور سیاسی اور فکری اعتبار سے ترقی پسندوں سے زیادہ ترقی پسند کہ دیوبند عملی طور پر طبقاتی امتیاز کا مخالف ہے اور غریب اور مزدور طبقات کا حامی اور اِس مدرسے میں سب سے زیادہ تعداد ایسے ہی غرباء مساکین یتامیٰ کی ہے جن کے لیے ترقی پسند ہمیشہ آواز اٹھاتے رہے ہیں۔

مجھے دیوبند کی ترقی پسندی عزیز ہے مگر میرے ساتھ المیہ یہ ہے کہ میں کسی مسلک یا مشرب کا پیروکار نہیں ہوں۔ مسلک کی اسیری راس نہیں آتی۔ میں ایک آزادہ رَو انسان ہوں مگر تمام مسالک شریعت وطریقت کا احترام کرتا ہوں۔ ہاں اگر زندگی کے کسی مرحلے میں کسی مسلک کو قبول کرنے کی مجبوری آن پڑی تو یقیناً وہ مسلک دیوبندی ہوگا کہ علامہ اقبال کے بقول ''دیوبندی نہ فرقہ ہے نہ مذہب، ہر معقول پسند، دین دار آدمی کا نام دیوبندی ہے''

[گو میں معقول پسند بھی نہیں مگر دیوبند کی نظری
معقولیت اور فکری توازن اور اعتدال سے مجھے ذہنی
مناسبت ہے۔]

یہ کتاب دیوبند سے تعلق کی محض ایک تمہید ہے۔ میری آرزو بس یہی ہے کہ اس تمہید کی تمدید ہو۔ مجھے احساس ہے کہ میں جس طور پہ یہ کام کرنا چاہتا تھا، حالات نے مساعدت نہیں کی کہ میرے ساتھ مسائل زیادہ ہیں اور وسائل نہایت کم۔ اپنی کیفیت کچھ یوں ہے:

ہر لمحہ اضطراب ہے ہر لحظہ انتشار
دل کا وہی ہے حال جو دنیا کا حال ہے
—حسن نعیم

یہی وجہ ہے کہ اس کتاب میں بہت سے اہم گوشے رہ گئے۔ بہرحال یہ میری خوش نصیبی ہے کہ مدتوں بعد دیوبند سے تعلق کی ایک صورت تو نکلی۔

میری یہ کتاب نہ علمی ہے، نہ تحقیقی۔ بس یہ دیوبند سے تعلق کا ایک اظہار ہے! اس اظہار کو آپ کوئی بھی نام دے دیں، مجھے قبول ہوگا یا آپ اس اظہار کو لااظہار بھی کر سکتے ہیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔

اس کتاب میں، میں نے جو کچھ لکھا ہے، دل سے لکھا ہے۔ غلط ہے یا صحیح، مجھے کچھ پتہ نہیں کہ بچپن ہی سے میں غلط اور صحیح کی منطق میں الجھا رہا اور آج تک یہ سلجھ نہ سکا کہ اقوام وملل، زمان و مکاں، مقام ومحل کے اعتبار سے غلط اور صحیح کے معیارات بدلتے رہتے ہیں۔ کوئی ضروری نہیں کہ کسی قوم کی نظر میں جو صحیح ہو وہ دوسری قوم کی نظر میں غلط نہ ہو۔ ایک جھوٹ کب سچ بن جائے اور سچ کب سراسر جھوٹ میں تبدیل ہو جائے، کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

[صحیح اور غلط کا غلط سلط کھیل یونہی جاری ساری
رہے گا۔ دنیا میں سارا کھیل تو اسی غلط اور صحیح کا ہے۔
جنگی جنون، جارحیت، استعماریت، جبر وتشدد اور فرقہ
واریت بھی اسی کھیل کا ایک حصہ ہے۔]

تاریخ، تہذیب، ادب، سیاست، معاشرت اسی غلط اور صحیح کی ریاضیات میں مدتوں سے الجھی ہوئی ہے۔ غلط اور صحیح کا فیصلہ انسان کا ذہن نہیں، ضمیر کرتا ہے اور جب ضمیر ہی مرجائے تو — میں غلط اور صحیح کے الجھاوے سے آزاد ہو کر لکھتا ہوں۔ اس لیے نہ طعن وتشنیع کی پرواہ ہے اور نہ تحسین کی تمنا۔

میرے دل کی تختی پر جو عبارتیں ابھریں انہیں بس اتار دیا ہے۔ ممکن ہے آپ کی نظر میں یہ غلط ہوں مگر کسی اور کی نظر میں صحیح بھی ہو سکتی ہیں۔ میں نے کوشش کی ہے کہ تخلیقی متن سے براہِ راست مخاطبہ ہو۔ اس لیے بعض تخلیق کاروں کا تذکرہ کتاب میں شامل نہیں ہو پایا کہ بسیار کوشش کے باوجود اُن کے متن تک رسائی ممکن نہ ہو سکی۔ ممکن ہے اگلے سفر میں اُن تک رسائی ہو جائے۔

مجھے یہ کام نہایت یکسوئی اور تن دہی سے کرنا چاہیے تھا کہ یہ محنت طلب کام تھا مگر میرے راستے میں رکاوٹیں بہت تھیں۔ اس لیے بعجلت تمام یہ کام پورا کیا کہ یہ صفحات اگر اشاعت کی قید سے آزاد ہوتے تو ممکن تھا کہ دیمک کی نذر ہو جاتے یا کباڑ خانے کی زینت بن جاتے۔ اس لیے

اس کتاب کی تمام تر خامیوں کا مجھے احساس ہے اور مجھے اُس سے زیادہ اُس طبقے کی خاموشی اور بے حسی کا بھی احساس ہے۔ پھر بھی یہ کتاب پیش ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ذہنی جمود ٹوٹے اور پھر سارے گلے شکوے دور ہوجائیں۔

اس کتاب کے بارے میں لوگ کچھ کہیں نہ کہیں، مگر مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب لوگوں سے کچھ نہ کچھ کہہ پانے میں کامیاب ہوگی، بس یہی مقصد ہے لکھنے کا اور یہی خواہش ہے کہ میرے الفاظ متحرک رہیں۔ ذہنوں میں جاکر منجمد نہ ہوجائیں۔

مجھے صرف اور صرف الفاظ کے انجماد سے ڈر لگتا ہے۔ باقی تو:

کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

یہ کتاب کی پہلی جلد ہے۔ دوسری جلد میں کوشش کی جائے گی کہ دیوبند سے وابستہ تمام تخلیق کاروں کے فنی اور فکری تجزیاتی مطالعات اور وہ تمام گوشے آجائیں جو اس کتاب میں نہیں شامل ہوسکے۔

کچھ نام اور کچھ اہم باتیں چھوٹ گئی ہیں تو میں کیا کروں۔ میری بساط بہت محدود ہے اور علم تو ایک قطرے سے بھی کم—

اور سچ پوچھیے تو یہ 'ایک قطرہ' بھی ایک طرح سے تعلّی ہی ہے کہ دانش مندوں کی بہتات سے علم کا فقدان ہوگیا ہے—!

کتاب کی تشکیل سے کہیں زیادہ دشوار کام کتاب کی اشاعت وطباعت ہے۔ میری طرح روز کنواں کھود کر پانی پینے والوں کے لیے تو یہ اور بھی مرحلۂ عسر العبور ہے مگر نصرتِ غیبی سے یہ راہ بھی آسان ہوگئی۔ آل انڈیا تنظیم علماء حق نئی دہلی نے بطیبِ خاطر اس کی اشاعت کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی۔

مجھے یقین نہیں تھا اور یقین نہ آنے کی وجہ بھی تھی کہ زیادہ تر ملّی تنظیموں کا ارتکاز چندے کی افزونی اور تکثیر پر ہوتا ہے۔

[انہیں اپنے ادارے کے تعارف نامے اور کتابچوں
کی اشاعت سے ہی دلچسپی ہوتی ہے۔]

ایسی کتابوں کی اشاعت ان کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی جن سے براہِ راست کسی قسم کے فائدہ

کی توقع نہ ہو۔ میری کتاب بھی اسی نوعیت کی تھی جس سے کوئی فائدہ مربوط نہیں ہے۔

مگر میرا گمان غلط ٹھہرا۔ آل انڈیا تنظیم علماء حق دہلی نے مجھ سے کہیں زیادہ دلچسپی اس کتاب میں لینی شروع کی۔ مجھے ایسا لگا کہ بعض تنظیمیں یقیناً ایسی ہیں جو سود و زیاں کا خیال کیے بغیر علم و ادب کی اشاعت سے بھی دلچسپی رکھتی ہیں اور انہیں میں یہ تنظیم علماء حق بھی ہے۔ اس تنظیم کے جنرل سکریٹری مولانا محمد اعجاز عرفی القاسمی سے گو کہ میرے زیادہ مراسم نہیں ہیں اور نہ ہی زیادہ ملاقاتیں اور نہ میں ان کے معاملات سے آگاہ مگر 'اجنبیت' کے باوجود محض دیوبند کی نسبت سے ان کی گرم جوشی، عطوفت اور محبت سے جو تجربہ ہوا، وہ سابقہ تجربوں سے قطعی مختلف اور نہایت شیریں تھا، اس لیے ان کی یقین دہانی پر مجھے زیادہ تذبذب نہیں ہوا۔ میں نے کسی اور ادارے کی طرف رجوع کرنا مناسب نہیں سمجھا کہ مومن جب وعدہ کرتا ہے تو وفا بھی کرتا ہے۔

مجھے احساس ہوا کہ مولانا اعجاز عرفی نہ صرف یہ کہ علم و ادب کے شیدائی ہیں، شعر و ادب کا عمدہ ذوق رکھتے ہیں بلکہ اپنی تنظیم علماء حق کے ذریعے بعض وہ کارنامے انجام دے رہے ہیں جن کی طرف ہندوستان کی دوسری تبلیغی، تحریکی اور ملی تنظیموں کا دھیان نہیں ہے۔ انہیں اس بات کا احساس ہے کہ مغربی میڈیا اور منفی ذرائع ابلاغ سے مبارزت کے لیے تنظیمی تعارف ناموں کی نہیں، ایسے علمی ادبی لٹریچر کی بھی ضرورت ہے جن میں اسلام مخالف اعتراضات اور اسلام دشمنوں کے شکوک و شبہات کا جواب ولی اللہی اسلوب میں دیا جائے۔

تنظیم علماء حق بھی ولی اللہی فکر سے جڑی ہوئی ایک تنظیم ہے جس کے مقاصد جلیل بھی اور عظیم بھی ہیں اور اس تنظیم نے بہت مختصر مدت میں جو مقبولیت شہرت حاصل کی ہے اس میں بہت کچھ دخل مولانا اعجاز عرفی کی بلند حوصلگی اور خلوص وصداقت کا بھی ہے۔

میں ''آل انڈیا تنظیم علماء حق'' نئی دہلی، کے جنرل سکریٹری مولانا محمد اعجاز عرفی کا بطور خاص ممنون ہوں جنہوں نے مجھ حقیر فقیر کی کتاب شائع کرنے کا بار برداشت کیا اور مجھے بہت سی ذہنی کلفتوں سے محفوظ رکھا۔ اللہ انہیں اس کا جزائے خیر عطا فرمائے، آمین، ثم آمین!

اپنے احباب میں عبدالقادر شمس قاسمی، (ہفت روزہ عالمی سہارا، نئی دہلی)، عابد انور (یو۔این۔ آئی) کا شکریہ بھی ضروری ہے کہ ان احباب نے کتاب کی تشکیل وتکمیل کے لیے ہمیشہ مہمیز کیا اور میرے راستے میں آنے والی تمام رکاوٹوں کو دور کرنے کی تدبیریں بھی کیں۔

اپنے عزیز دوست جناب محمد اکرام کا بطور خاص شکریہ جن کی عنایتیں ہمیشہ میرے ساتھ رہی

ہیں، انہوں نے اس کتاب کی برقی کتابت میں جس لگن، دلچسپی اور انہماک کا ثبوت دیا، اتنی دلچسپی شاید میں نے بھی نہیں لی۔ یہ اُن کا خاص کرم ہے۔ باوجودیکہ وہ مسلکاً اہلحدیث ہیں مگر دیوبند پر لکھی ہوئی اس کتاب میں وہ مکمل طور پر شامل ہیں۔

محترم نعمان فاروقی کی شفقت وعطوفت کا شکریہ کہ ان کے طفیل میرے ٹوٹے پھوٹے لفظوں کی رسائی ان علاقوں اور عوام تک ہورہی ہے جو میرے لیے اجنبی ہیں اور جن سے رشتہ قائم کرنا شاید میرے لیے اتنا آسان نہ ہوتا۔

نزہت ناز (میری رفیقِ حیات) الیفہ قاسمی، ارسلان شکیب، انیقہ قاسمی، ارومہ قاسمی میری زندگی کے چاند ستارے ہیں۔ ان کی محبتیں بھی ساتھ رہی ہیں اور کسی نہ کسی طور پر اس کتاب کی تشکیل میں یہ سب شامل رہے ہیں۔

[ارومہ، انیقہ، ارسلان، الیفہ کے نانا جناب ماسٹر محمد عاشق (کرسیل، اَرریا) اور نانی بی بی فیروزہ خاتون کا شکریہ کہ ان کی شفقتوں نے زندگی کے دشوار گزار سفر کو آسان بنائے رکھا۔]

میرے ابا حضور جناب عبدالصمد یقیناً میری اس کتاب سے خوش ہوں گے کہ ان کی خواہش کا نہ صرف یہ احترام ہے بلکہ ان کی دیرینہ آرزو کی تکمیل بھی اسی کتاب سے ہورہی ہے۔ اس کتاب سے ان کی آنکھوں میں مسرت جاگ اٹھے گی۔ یہی مسرت میری محنت کا ماحصل ہے!

اپنے برادران محترم عبدالاحد، ڈاکٹر عبدالرب فلاحی، برادران عزیز عبدالرحمٰن فلاحی، عبدالرحیم فلاحی، عبداللہ مالکی اور بہنیں بی بی کلثوم، بی بی مریم فلاحی کی نیک خواہشات اور دعائیں ہمیشہ میری بھٹکتی راہوں کو 'منزل' دکھاتی رہی ہیں۔ ان سب کا شکریہ بھی میرے اوپر واجب ہے۔

سب سے اخیر میں اپنی پہلی درس گاہ، آنسوؤں سے خط لکھنے والی ماں کو یاد کرنا ضروری ہے، جن کے 'خط' اکثر میری آنکھوں سے بہتے رہتے ہیں۔

۳۰ رمئی ۲۰۰۶ء

حقانی القاسمی

دارالعلوم دیوبند — علمی وفکری روایت

انار اور آزادی کی تحریک

آزادی کی تحریک میں 'انار' کے اس درخت کا نہایت نمایاں کردار ہے جس کی شاخوں کے سائے میں ایک ایسے عربی مدرسہ کی بنیاد پڑی جو آزادی کے متوالوں کی آماجگاہ اور اسلامی افکار و آثار کے تحفظ کا مرکز بنا۔

وہ 'انار' استعماریت سے آزادی کی جنگ کا اعلان بھی تھا اور اپنے قومی مذہبی، تہذیبی تشخص کی بقا کی جدوجہد کا آغاز بھی—

دیوبند کی مسجد چھتہ میں واقع انار کا وہ درخت دراصل ''شجر عرفان'' تھا جس کی ضیابار کرنوں سے ظلمت کدہ ہند روشن ہوگیا۔ ثمودین (دیوبند کے ملا محمود، بریلی کے محمود حسن) سے وہاں جس تعلیمی سلسلے کا آغاز ۱۵ر محرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۷ء کو ہوا، اس کے تسلسل میں کوئی تعطل واقع نہیں ہوا۔

انار نے اس نصرانی نار کو 'نور' میں بدل دیا جس کی تپش سے ملک کا خود مختار سیاسی، تہذیبی وجود جل کر راکھ میں تبدیل ہو رہا تھا۔ انگریزوں کی آگ کو نہ بجھایا جاتا تو ملک کے پاؤں میں غلامی کی زنجیریں ہوتیں، گلے میں اسیری کا طوق اور چپے چپے پہ عیسائیت کا علم لہراتا نظر آتا— تہذیبی تنوع اور ثقافتی تکثیریت پہ نازاں قدیم ہندوستان ایک 'فسانۂ کہن' بن کے رہ جاتا۔ اس کی تاریخ، تہذیب، حکمت و دانش سب ملبے کا ڈھیر بن چکی ہوتی۔

برطانوی سامراجی استعمار کی توسیع پسندانہ پالیسیوں کے خلاف علماء نے جو آزادی کی جنگ لڑی، اس میں اس عربی مدرسہ کا کردار نہایت اہم ہے جو اسلامی راسخ العقیدگی کے باوجود سیاسی روشن خیالی کا ایک تابناک استعارہ ہے، جس کی سیاسی تصوریت میں کسی طرح کی مذہبیت شامل نہیں تھی، جو قومی اور وطنی معاملات میں نہایت شفاف کردار کا حامل ہے اور جس نے قومی ہم آہنگی اور یک جہتی کے جذبے کی پرورش کی اور کبھی مذہبی خطوط پر سیاسی اور دینی فکر کو نہیں پرکھا بلکہ جمہوری افکار، قومی اتحاد کی جڑیں مضبوط کیں اور وطن کے مفادات کو ترجیح دی۔ وطن کی آزادی کی راہ میں مذہب کو حائل نہیں ہونے دیا۔

دیوبند کے شفاف سیاسی کردار اور سامراجیت مخالف اظہار کی وجہ سے ہی مسلمانوں کے اس ادارہ کی ترقی و توسیع میں برادرانِ وطن کی محبتیں، شفقتیں، عنایتیں اور عقیدتیں بھی شامل رہی ہیں۔ دیوبند کے دوامی چندہ دہندگان میں منشی تلسی رام، رام سہائے، منشی ہرداری لال، لالہ بیج ناتھ، پنڈت سری رام، منشی موتی لال، رام لال، سیوا لال، جیسے غیر مسلم حضرات بھی ہیں اور لائبریری کو کتابوں کا گراں قدر عطیہ دینے والوں میں منشی نول کشور کا نام سرفہرست ہے جس کی پوری تفصیل مع جذبات تشکر و امتنان دارالعلوم کی روداد میں موجود ہے:

> ''ارباب شوریٰ مدرسہ نہایت شکر گزار ہیں جناب منشی نول کشور صاحب مالک مطبع اعظم لکھنؤ کے جنہوں نے مثل سابق کمال دریا دلی فرمائی اور چند کتب مفید سے امداد مدرسہ میں ہمت فرمائی۔'' (تاریخ دارالعلوم دیوبند، جلد اول، ص:۱۶۸)
>
> ''جناب منشی نول کشور مالک اودھ اخبار اور جناب راؤ امر سنگھ صاحب مالک اخبار سفیر بڈھانہ کا بالخصوص شکریہ کہ باوجودیکہ یہ دونوں صاحب اہل ہنود سے ہیں مگر آفریں صد ہزار آفریں ان کی سخاوت اور عنایت پر اپنے اخبارات گراں بہا اس مدرسہ کو مفت عنایت فرماتے ہیں۔ جملہ ارباب شوریٰ مدرسہ ہذا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں اور سب صاحبوں کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ ان کے اخبارات اور کارخانہ جات کو مستدام ترقی عطا فرمائے اور ان کی قوت و آزادی کو قائم رکھے۔
>
> (روداد ۱۲۹۴ھ بحوالہ تاریخ دارالعلوم دیوبند، ص: ۱۶۸-۱۶۹)

مسلمانوں کا یہی وہ مذہبی ادارہ ہے جہاں ہندو طلباء کی خاصی تعداد بھی زیر تعلیم تھی۔ اس کی روداد میں صاف لکھا ہے کہ یہاں فارسی و ریاضی کے درجات میں ہندو لڑکے بھی پڑھتے ہیں اور بقول محبوب رضوی ''دارالعلوم میں ہندو بچوں کی تعلیم کا سلسلہ ایک عرصے تک جاری رہا ہے۔ جب

برطانوی حکومت نے سرکاری ملازمتوں کے لیے سرکاری اسکولوں کی سند کو ضروری قرار دے دیا تو سرکاری ملازمتوں کے خواہش مند مسلم بچوں کی طرح ہندو بچوں کی تعلیم کا رخ بھی سرکاری اسکولوں کی طرف پھر گیا۔ (تاریخ دارالعلوم، جلد: اول، ص:۱۹۳)

اور خوشگوار بات یہ ہے کہ غیر مسلم طلباء کے والدین اپنے بچوں کو دیوبند کے عربی مدرسہ میں بھیجنے میں مسرت محسوس کرتے تھے۔

اسی طرح مدرسہ فرنگی محل لکھنؤ میں بھی ہندو طلباء پڑھتے تھے اور حسن سنجری نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''شیخ نظام الدین اولیاء کی خانقاہ میں ہندو جوگی آتے تھے'' انہوں نے بعض ایسے کلمہ پڑھنے والے ہندوؤں کا ذکر کیا ہے جو وحدانیت اور رسالت پر یقین رکھتے تھے۔

عربی مدرسہ دیوبند کے سب سے پہلے طالب علم مولانا محمود حسن نے جو بعد میں شیخ الہند کے نام سے مشہور ہوئے۔ انگریزوں کے خلاف جب آزادی کی مہم شروع کی تو مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا محمد میاں منصور انصاری، مولانا عزیر گل، مولانا سیف الرحمٰن، مولانا احمداللہ، مولانا ظہور محمد خاں، مولانا محمد صادق کراچوی وغیرہم کے ساتھ اس مشن میں غیر مسلم رفقائے انقلاب کی ایک بڑی تعداد بھی تھی جو حضرت کی کوٹھی میں اکثر قیام کرتی تھی— اور انہی کے جذب اور جنون سے ملک کو انگریزوں کی غلامی سے نجات ملی۔ ان کی اذیتوں نے ہی آزادی کی راہ ہموار کی۔ ہندو مسلمان دونوں نے شانہ بشانہ سامراج کے خلاف لڑکر ہندوستان کی تہذیب و تاریخ اور قدیم ثقافت کو اذیت اور تباہی سے بچا لیا۔ اس وقت ہندو مسلم اتحاد کا حال نواب مزمل اللہ خاں کی صاحبزادی زاہدہ خاتون شیروانیہ کی زبان میں کچھ یوں تھا:

کہتے ہیں ہم کو ہندی حب وطن ہے ایماں
کیا پوچھتے ہو دین و نام و نشاں ہمارا
آلام مسلمیں پر بولے تڑپ کے ہندو
سود و زیاں ہے ان کا سود و زیاں ہمارا

دیوبند اور متحدہ ہندوستانی قومیت

تاریخ تحریک آزادی کی عبارت کے مطابق ہندوستان آزاد ہوا اور پھر متحدہ ہندوستان دو ٹکڑوں میں تقسیم بھی ہوا۔ مکمل آزادی کی طرف ہندوستان بڑھ ہی رہا تھا کہ انگریزوں نے متحدہ خواب کا خون کر دیا۔ ہندو مسلم اتحاد انتشار کا شکار ہوگیا۔ انگریزوں کے خلاف متحدہ قوت دو خیموں

میں بٹ گئی۔ دونوں حلیف قوتیں استعماری سازش سے حریف بن گئیں۔ ہندو اور مسلم احیائیت پسندی نے سر ابھارنا شروع کر دیا۔ آزادی کے لیے متحدہ جنگ لڑنے والے آپس میں ہی لڑنے لگے۔ ایک طرف انڈین نیشنل کانگریس تھی، جس کی تشکیل ایک انگریز 'اوہیوم' نے کی تھی۔ تو دوسری طرف مسلم لیگ تھی جو انگریزوں کی وفادار اور پروردہ تھی۔ ہندوستان دو گروہ میں بٹ گیا تھا۔ کانگریس میں ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کی اکثریت تھی مگر مسلم لیگ میں کوئی بھی ہندو نہیں تھا۔ مسلم علیحدگی پسندی اور فرقہ پرستی کے خلاف مسلمانوں نے موثر آواز بلند کی۔ یہاں بھی مسلمانوں نے فراخ دلی اور وسعت نظری کا ثبوت دیا جب کہ ہندوؤں نے ایسا کوئی روشن نقش نہیں چھوڑا۔ دیوبند کی سیاسی فکر سے وابستہ علماء کی جماعت نے مسلم لیگ کی شدید مخالفت کی اور قیام پاکستان کے نعرے کو اسلام مخالف قرار دیا۔ دیوبند نے جداگانہ قومی شناخت کے تصور کو مسترد کیا اور اپنی فکر اور رویے سے متحدہ قومیت کی حمایت اور وکالت کی اور مذہبی بنیاد پر ملک کی تقسیم کو گوارا نہیں کیا۔

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نے جب بیان دیا کہ "اقوام اوطان سے بنتی ہیں" تو اس وقت علامہ اقبال کی جو اضطرابی کیفیت تھی، اس کا بیان پروفیسر فتح محمد ملک کی زبانی یوں ہے "ایک روز اخبارات کی سرخیاں سناتے وقت وہ یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ اقبال بار بار ایک ہی خبر سنانے کا تقاضا کر رہے تھے۔ اس نوجوان طالب علم (میاں محمد شفیع) نے جب یہ دیکھا کہ یہ جملہ سن کر کہ "اقوام اوطان سے بنتی ہیں" علامہ کا ہاتھ وہیں کا وہیں رک گیا۔ ابھی انہوں نے ایک ہی لقمہ توڑا تھا کہ یہ فقرہ کان میں پڑا تو انہوں نے استفسار فرمایا کہ کیا واقعی یہ مولانا حسین احمد مدنی کا قول ہے۔ جب اس نوجوان نے اثبات میں جواب دیا تو انہوں نے لقمہ واپس پلیٹ میں رکھ دیا اور چاہا کہ وہ اس پوری خبر کو بار بار پڑھے۔ اقبال سنتے رہے اور وہ ان کے چہرے پر درد و کرب کے آثار کو نمایاں تر ہوتے دیکھتا رہا۔ اس صبح انہوں نے نہ کسی اور خبر کی طرف دھیان دیا اور نہ ہی ناشتہ کیا۔"

علامہ اقبال نے اس وقت ایک نظم لکھی اور ان کا اضطراب ہلکا ہوا۔ "احسان لاہور" میں یہ نظم چھپی۔ نظم یوں تھی:

عجم ہنوز نداند رموز دیں ورنہ ز دیوبند، حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست اگر او نہ رسیدی تمام بولہبی است

مولانا حسین احمد مدنی نے ۱۹۴۰ء میں "متحدہ قومیت اور اسلام" کے عنوان سے ایک کتابچہ تحریر کیا۔ اس کتاب کی بابت پروفیسر فتح محمد ملک نے لکھا ہے "اس کتاب میں انہوں نے متحدہ

ہندوستانی قومیت کی بنیاد پر اکھنڈ بھارت کے کانگریسی موقف کے اسلامی جواز پیش کر رکھے ہیں۔ مولانا نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ پاکستان کا تصور اور پاکستان کی تحریک ہر دو اسلام کے منافی ہیں اس لیے اسلامیانِ ہند کو مسلم لیگ کے بجائے انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو کر اپنے وطن ہندوستان کو متحد رکھنا چاہئے۔''

علماء کی اس فکر کو دیکھتے ہوئے علامہ اقبال نے یہاں تک لکھا کہ ''زمانے کا الٹ پھیر عجیب ہے کہ ایک وقت تھا کہ ہم مغرب زدہ پڑھے لکھے مسلمان تفرنج میں گرفتار تھے۔ اب علماء اسی لعنت میں گرفتار ہیں۔'' ان کے علاوہ دیوبند کے فاضل، شیخ الہند کے شاگرد مولانا عبیداللہ سندھی (۱۸۷۲-۱۹۴۴ء) کا بھی متحدہ ہندوستان کا یہی نظریہ تھا۔ پروفیسر فتح محمد ملک لکھتے ہیں ''مولانا سندھی نے ترکی میں اپنی جلاوطنی کے زمانے میں ہی اسلامی اتحاد کے خوابوں سے دست برداری کا کھلم کھلا اعلان کر دیا تھا۔ استنبول سے انہوں نے ریاست ہائے متحدہ ہندوستان کا جو خاکہ شائع کیا تھا اس میں انہوں نے اعلان کیا تھا کہ ان کی جلاوطن سوراجیہ ہند پارٹی انڈین نیشنل کانگریس ہی کا ایک ذیلی گروہ ہے جو مذہب کو فقط ذاتی زندگی کے دائرے تک محدود رکھتے ہوئے لسانی اور جغرافیائی بنیادوں پر ہندوستان کو دس ریاستوں کے ایک وفاق کی صورت میں متحدہ رکھنے کا خواہاں ہے۔ اسلامیانِ ہند میں قرار داد پاکستان کی روز افزوں مقبولیت کے زمانے میں جب انہوں نے جمنا، نرمدا، سندھ، ساگر پارٹی قائم کی تب بھی ایک متحدہ ہندوستان کی بقا ہی کو اپنا سیاسی مسلک قرار دیا۔''

علامہ اقبال اس متحدہ ہندوستان اور وطنیت کے تصور کے سخت مخالف تھے۔ اسی لئے انہوں نے وطنیت کے جدید فرنگی نظریئے اور حبِ وطن دونوں میں فرق اور فاصلہ قائم کرتے ہوئے یہ لکھا ''مولانا حسین احمد عالم دین ہیں اور جو نظریہ انہوں نے قوم کے سامنے پیش کیا ہے، امت محمدیہ کے لیے اس کے خطرناک عواقب سے وہ بے خبر نہیں ہو سکتے۔ آپ نے سوچا نہیں کہ آپ اس توجیہ سے دو غلط اور خطرناک نظریئے مسلمانوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ ایک یہ کہ مسلمان بحیثیت قوم اور ہو سکتے ہیں اور بحیثیت ملت اور۔ اور دوسرا یہ کہ از روئے قوم چونکہ وہ ہندوستانی ہیں اس لیے مذہب کو علیحدہ چھوڑ کر انہیں باقی ماندہ اقوام ہند کی قومیت یا ہندوستانیت میں جذب ہو جانا چاہیے۔ یعنی یہ کہ مذہب اور سیاست جدا جدا چیزیں ہیں۔ اس ملک میں رہنا ہے تو مذہب کو محض انفرادی اور پرائیویٹ سمجھو اور اس کو افراد تک ہی محدود رکھو۔ سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کو کوئی دوسری قوم تصور نہ کرو اور اکثریت میں مدغم ہو جاؤ۔ حضور رسالت مآب کے لیے راہ بہت آسان تھی کہ آپ ابولہب یا ابوجہل یا کفار مکہ سے یہ فرماتے کہ تم اپنی بت پرستی پر قائم رہو ہم اپنی خدا پرستی پر قائم رہتے ہیں۔

مگر اس نسلی اور وطنی اشتراک کی بنا پر جو ہمارے اور تمہارے درمیان موجود ہے، ایک وحدت عربیہ قائم کی جاسکتی ہے۔ اگر حضور نعوذ باللہ یہ رائے اختیار کرتے تو اس میں شک نہیں کہ یہ ایک وطن دوست کی راہ ہوتی لیکن نبی آخرالزماں کی راہ نہ ہوتی۔ نبوت محمدیہ کی غایۃ الغایات یہ ہے کہ ایک ہیئت اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے جس کی تشکیل اس قانونِ الٰہی کے تابع ہو جو نبوت محمدیہ کو بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوا تھا۔"

علامہ اقبال نے سیاسی وطنیت کے تصور کو ٹھکراتے ہوئے کہا:

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے، وہ مذہب کا کفن ہے

پروفیسر فتح محمد ملک لکھتے ہیں "سرکردہ علمائے دین کا متحدہ ہندوستانی قومیت پر ایمان لے آنا یا دوسرے لفظوں میں سب سے پہلے ہندوستان اور آخر میں اسلام کا سیاسی مسلک اپنا لینا ایک ایسی دلخراش حقیقت تھی جو پایانِ عمر اقبال کے لیے سوہانِ روح بن کر رہ گئی تھی۔ جداگانہ مسلم قومیت اور متحدہ ہندوستانی قومیت کے مابین نظریاتی آویزش کو اقبال نے دین و وطن کی کشمکش یا روح و بدن کی معرکہ آرائی کا نام دیا ہے۔ دین کے اجتماعی مسلک سے بیشتر علمائے دین کی کنارہ کشی کے ہولناک نتائج کا خیال کر کے اقبال کا دل کانپ اٹھتا تھا۔ ایسے میں وہ تڑپ کر یہ سوال کیا کرتے تھے:

بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکہ دین و وطن
اس زمانے میں کوئی حیدر کرار بھی ہے

(پروفیسر فتح محمد ملک--- علامہ اقبال، مولانا مدنی اور آزاد)

علامہ اقبال کی اس سیاسی فکر کے برعکس علماء دیوبند کا جو تصور قومیت تھا وہ صوفیا کے طریقت کے تصور پر مبنی تھا۔ مرزا مظہر جانِ جاناں بھی متحدہ ہندوستانی قومیت کے قائل تھے۔ جیسا کہ مقاماتِ مظہری اور ان کے مکتوب سے ظاہر ہے جسے پڑھا جائے تو بادی النظر میں داراشکوہ کے سرِ اکبر کا کوئی ٹکڑا محسوس ہوتا ہے۔ جس میں ہندو مسلمان ارتباط کی بات کی گئی ہے اور مشترک اقدار کی وکالت کی گئی ہے۔ مولانا مدنی نے متحدہ قومیت کا جو تصور دیا وہ دراصل تصوف کے سلسلے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے تھا کہ ان کی نظر میں تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا مدنی نے اکبر کے تصور اور طرزِ عمل کی تائید و توثیق کی اور زعفرانی رنگ کے کپڑے پہننے پر اُسے تالیفِ قلب کا ایک

معاملہ قرار دیا۔ مولانا مدنی نے اکبر کی مخالفت کرنے والوں کو غافل اور کم سمجھ قرار دیتے ہوئے یہ لکھا کہ ''اختلاط باعث عدم تنافر ہے اور وہ اقوام کو اسلام کی طرف لانے والا ہے اور تنافر باعث ضد اور ہٹ اور عدم اطلاع علی المحاسن ہے اور وہ اسلامی ترقی میں سدِ راہ ہونے والا ہے۔''

دیوبند مکمل طور سے متحدہ قومیت اور نیشنلزم کا علمبردار رہا۔ اس نے کبھی مذہبی خطوط یا فرقہ وارانہ سطح پر نہیں سوچا۔ علماء دیوبند کی نیشنلزم کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ حکومت ہند کا جو نقشہ مرتب کیا گیا تھا، اس کے لیے نگاہِ انتخاب متھرا کے رئیس علی گڑھ کے اولڈ بوائے راجہ مہندر پرتاپ (۱۸۸۶-۱۹۷۹ء) پر پڑی۔ دیوبند نے ہمیشہ ہندوستان کے سیکولر تشخص کی بنیادوں کو مضبوط کیا اور اس کو وسعت عطا کی۔ اس کی نیشنلزم ہندو مہاسبھا کے قائد ونائک دامودر ساورکر (۱۸۸۳-۱۹۶۶ء) اور مادھو شیو گولوالکر (۱۹۰۶-۱۹۷۳ء) سے مختلف تھی جنہوں نے ہندوتو کا نعرہ بلند کیا اور ہندو نیشنلزم کی بنیاد رکھی اور ہندوستان کی سیکولر بنیادوں کو کمزور کیا۔ جب کہ دیوبند کے فکری سلسلے سے متعلق علماء نے مسلم فرقہ پرستی کے خلاف آوازیں اٹھائیں اور کانگریس کی سیکولرزم کی نہ صرف تائید وتوثیق کی بلکہ ہر مرحلے پر سیکولرزم کے علم کو بلند رکھا۔ علامہ شبلی کا تعلق بھی بقول نارنگ ''علماء دیوبند کی اس جماعت سے تھا جو حریت پسندی اور سیاسی جدوجہد کی علم بردار تھی۔'' شبلی نعمانی کانگریس کے ہمنوا اور مسلم لیگ کے شدید ترین مخالف تھے۔ انہوں نے اسی مقصد کے تحت مسلم گزٹ لکھنؤ سے شائع کروایا اور لیگ کی پُرزور مخالفت کی۔ مسلم لیگ کی مخالفت اور مذمت میں انہوں نے کئی نظمیں بھی لکھیں۔ 'سیرت النبیؐ' کے مصنف ممتاز عالم دین علامہ شبلی کی جمہوری سیاسی فکر استعماریت اور فرقہ واریت مخالف رویئے کا اندازہ اس نظم کے چند اشعار سے ہوسکتا ہے جو مسلم لیگ کے خلاف انہوں نے لکھی ہے:

لیگ کی عظمت و جبروت سے انکار نہیں ملک میں غلغلہ ہے، شور ہے کہرام بھی ہے
ہے گورنمنٹ کی بھی اس پہ عنایت کی نگاہ نظر لطف رئیسان خوش انجام بھی ہے
مختصر اس کے فضائل کوئی پوچھے تو یہ ہیں محسن قوم بھی ہے خادم حکام بھی ہے
ربط ہے اس کو گورنمنٹ سے بھی ملک سے بھی جس طرح 'صرف' میں اک قاعدہ ادغام بھی ہے

گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

''شبلی نے ایک سچے ہندوستانی کی طرح قدمے سخنے آزادی کی جدوجہد کو تقویت پہنچائی۔ سید سلیمان ندوی کا بیان ہے کہ علماء میں مولانا پہلے شخص تھے جنہوں نے سیاسی مسئلوں میں دلچسپی لی اور کانگریس کی حمایت میں آواز بلند کی۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے

داعی تھے۔انہوں نے دونوں کی سیاسی مصالحت پر مضمون لکھے۔''
(تحریک آزادی اور اردو شاعری، ص:۳۳۱)

دیوبند کے فکری سلسلے سے جڑے ہوئے تمام اخبارات نہ صرف انگریز مخالف تھے بلکہ مسلم لیگ کی انگریز پرستی کے بھی سخت خلاف تھے۔ایسے بحرانی حالات میں دیوبند نے مسلم احیا پرستی کے خلاف مضبوط اور مستحکم موقف اختیار کیا اور فرقہ واریت کو کچل کر قوم واتحاد کو مضبوط کیا۔ جب کہ ہندو رجعت پسندی اور احیائیت اپنی جڑیں مضبوط کرتی رہی۔

یہ علماء دیوبند کی سادہ لوحی تھی کہ وہ قومی آزادی کے نام پر سیاسی دجل وفریب میں آگئے۔ وہ تو جداگانہ مسلم قومیت کی مخالفت کرتے رہے مگر قوم پرست قائدین در پردہ دوقومی نظریئے کی حمایت کرتے رہے۔مسلمانوں نے ہر قومی قائد پر اعتبار کیا۔ جب کہ اس وقت کے ممتاز قومی قائدین میں مسلمانوں کے لیے جذبۂ اخلاص کی کمی تھی۔انہیں اپنے مفادات سے مطلب تھا۔مسلمانوں کے تئیں ان کا جذبہ ہمدردی، حالات اور وقت سے مشروط تھا۔

اب جو تازہ حقائق سامنے آرہے ہیں وہ نہایت دل خراش ہیں۔مولانا ابوالکلام آزاد کو جب ایسے ہی حقائق کا علم ہوا تو وہ بھی حیران رہ گئے۔ المیہ یہ ہے کہ مہاتما گاندھی کو مولانا آزاد پر بالکل یقین اور اعتبار نہیں تھا۔ وہ وزارت تعلیم مولانا آزاد کو سپرد کئے جانے کے حق میں نہیں تھے۔ اسی طرح وزیر داخلہ مرد آہن سردار پٹیل کی نظر میں جمعیت علماء جیسی قوم پرست تنظیم، مسلم لیگ سے زیادہ خطرناک تھی۔ ان کی نگاہ میں مولانا آزاد نہایت غیر معتبر خطرناک، رفیع احمد قدوائی رشوت خور اور آصف علی برطانیہ کے تنخواہ دار تھے۔ اور بھی حقائق ہیں جو اب سامنے آرہے ہیں جن سے علماء دین اور مسلم قائدین کی سیاسی بصیرت اور دوراندیشی پہ سوالیہ نشان لگ جاتا ہے اور سیاسی فراست مشتبہ اور مشکوک قرار پاتی ہے۔

آزادی اور تقسیم ہند کے تعلق سے اب نظریاتی تبدیلی اور پیراڈائم شفٹ کا احساس بڑھتا جارہا ہے۔ حقائق کے نئے تناظر میں تقسیم سے جڑی ہوئی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو تحریک آزادی میں سادہ لوحی کی سزائیں ہی ملی ہیں۔ جنگ آزادی کے دوران بھی مسلمانوں کا ہی زیادہ جانی نقصان ہوا اور آزادی کے بعد بھی مسلمان ہی خسارے میں رہے۔ انگریزوں کے زمانے میں کم از کم مسلمانوں کو تعلق اور وثیقے ملے اور شوکت وحشمت بھی نصیب ہوئی۔ کلیدی عہدوں پر بھی فائز رہے مگر تقسیم کے بعد مسلمانوں کی حب الوطنی ہی مشکوک قرار پائی، ملازمتوں میں تخفیف ہوئی اور آرمس ایکٹ (arms act) کی زد میں سب سے زیادہ مسلمان آئے اور آزادی کے فوراً

بعد مسلمانوں کے گھروں کی تلاشی شروع ہوگئی۔ باورچی خانے میں چھری ملنے پر بھی مسلمانوں کو آرمس ایکٹ(arms act) اور ڈیفینس آف انڈیا(defence of India) کے تحت گرفتار کرلیا جاتا تھا۔

انگریزوں کے شدید مخالف ادارہ دارالعلوم دیوبند میں کبھی تلاشی جیسا اہانت آمیز واقعہ انگریزوں کے دور میں بھی پیش نہیں آیا لیکن آزادی کے بعد محض ایک کتابچے کی اشاعت پر دارالعلوم کی تلاشی لی گئی۔ یہ سانحہ اس ادارے کے ساتھ ہوا جس نے آزادی کی جنگ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔

تقسیم کے بعد

۱۹۴۷ء میں ملک آزاد نہیں بلکہ تقسیم ہوا کہ آزادی صرف انخلا کو مستلزم نہیں ہے بلکہ یہ اپنے معنی ومفہوم میں بڑی وسعت کا حامل ہے۔ انگریزوں کا انخلاء ان کی شکست نہیں بلکہ اُن کی فتح تھی کہ جس قوت اور طاقت کا انتشار ان کا مطلوب ومقصود تھا، وہ پورا ہو چکا تھا۔ ہندوستان کی سیاسی، معاشی طاقت ختم ہوچکی تھی۔ خود انگریزوں کے لیے ہندوستان میں مزید قیام زیاں کا سودا ہوتا۔ اس لیے انہوں نے ہندوستان کو خیر باد کہنے ہی میں عافیت سمجھی اور ایک بڑی طاقت اور متحدہ ہندوستان کو منقسم کر کے وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔

انگریزوں کے انخلاء کے بعد سب سے زیادہ اذیت اسی طبقے اور زبان کو اٹھانی پڑی جس نے انگریزوں کے خلاف آزادی کی جنگ شروع کی تھی اور استخلاصِ وطن کا نعرہ بلند کیا تھا۔ انقلابی علماء اور اردو نے انگریزوں کے خلاف سب سے زیادہ مزاحمتی کردار ادا کیا اور تقسیم ہند کے بعد بھی ان کی تقدیر سے اذیت اور مزاحمت ہی جڑی رہی۔

اردو اور اقلیت کے ساتھ جو ناانصافی ہوئی اس کی تاریخ میں تفصیل لکھ دی گئی ہے۔ شمیم حنفی نے اپنے ایک مضمون میں اس حقیقت کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

> ''اردو زبان وادب نے اکثریتی طبقے کی تہذیب، عقائد، ثقافت اور اسالیبِ فکر کو جس کشادہ قلبی کے ساتھ قبول کیا تھا وہ طبقہ زبان وادب کی تہذیبی قدر و قیمت اور اس کے فکری اور جمالیاتی عمل کو تسلیم کرنے کے معاملے میں اتنا ہی تنگ ذہن ہے۔''
> (شمیم حنفی، ہماری ادبی روایت کا تہذیبی حوالہ)

آزاد ہندوستان میں اردو اسیر کردی گئی اور ہندی قومی زبان بنا دی گئی۔ Lingua Franca کی لڑائی میں اُردو ہار گئی اور مسلمانوں کی تقدیر کے ساتھ جڑ گئی۔ کلچر اور مذہب سے زبان کا رشتہ جوڑ

دیا گیا اور زبان کے منطقائی، علاقائی اشتراک کو فراموش کر دیا گیا۔ ہندی ہندو، اور اردو مسلم زبان کے طور پر حریف بن گئی۔ دونوں اپنے صرفی نحوی ساخت، قواعد، صوتیات، نحویات کے اشتراک کے باوجود الگ الگ لسانی اظہار کی حیثیت سے آمنے سامنے آ گئے۔ ہندی اور ہندوی کا قدیم تصور اس لسانی معرکے میں کھو گیا اور گاندھی جی کی 'ہندوستانی' آزاد یعنی منقسم ہندوستان میں گم ہو گئی۔

جس اردو نے آزادی کی جنگ لڑی، انقلاب زندہ باد کا نعرہ دیا۔ آزادی یعنی تقسیم کے فوراً بعد آزادی کی وہی زبان، تقسیم کی زبان بن گئی۔۔۔!

سچ کہتے ہیں ملک، قوم اور زبان کی تقدیر بدلتے دیر نہیں لگتی۔

اقتدار تبدیل ہوا مگر ذہنیت تبدیل نہیں ہوئی اور آج تک اسی ذہنیت کی اذیت میں اُردو اور اقلیت دونوں مبتلا ہیں۔

پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستانی حکمراں 'اقتدار کی رومانیت' میں کھوئے رہے اور اقلیت اذیت سہتی رہی۔۔۔

لارڈ میکالے نے جو نسل پیدا کی تھی، وہ جسمانی اعتبار سے ہندوستانی تھی مگر ذہن و دماغ کے اعتبار سے انگریز تھی۔ اس لیے انگریزوں کے دور میں جو دیوبند، دہشت گردی کا اڈہ تھا، تقسیم ملک یعنی آزادی کے بعد بھی جوں کا توں رہا۔

کیا یہ صورتِ حال نہایت تشویشناک نہیں ہے کہ جن علماء نے سر پہ کفن باندھ کر تن بہ تقدیر انگریزی استعماریت کے خلاف جنگ لڑی، انہیں کو آزادی ملنے کے بعد دہشت گردوں کی قطار میں کھڑا کر دیا گیا اور وہ تمام علاقے (دیوبند، شاملی، تھانہ بھون، نانوتہ) جو برطانوی دورِ حکومت میں آزادی کے مرکز کی حیثیت رکھتے تھے، تقسیم ہند کے بعد ہندوستانی اقتدار کی نگاہوں میں بھی کھٹکنے لگے!

ایسا صلہ تو محسن کش مُیاں دیتی ہیں تو کیا یہاں کی مٹی بھی۔۔۔ کہیں شاعر علی حزیں نے سچ ہی تو نہیں لکھ دیا تھا۔۔۔؟

قرۃ العین حیدر نے ''کارِ جہاں دراز ہے'' میں لکھا ہے:

''بے شمار دیوبندی مولانا دین پرست انقلابی، جوشیلا قوم پرست، سر پہ کفن باندھ جیل میں گھس گیا، پھانسی چڑھا، کابل، تاشقند، ماسکو برلن، امریکہ فرار ہوا۔ یہاں اور وہاں بھوکوں مرا۔ مجھے ہے حکم اذاں لا الٰہ الا اللہ!''

دیوبند کے علماء آزادی کی اذان دیتے رہے اور ستون دار پہ سروں کے چراغ جلاتے رہے،

اپنے گھروں کو آگ لگاتے رہے۔ جب اذان کو منزل مل گئی تو اس اذان کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر اسے مسلسل اذیت کی آگ میں جھونک دیا گیا۔ آزادی کے بعد اذان سے اکثریت کو اذیت محسوس ہونے لگی۔

اقتدار پرست اکثریتی طبقے نے مجاہد کی اس اذاں کو بالکل بھلا دیا جس کے آہنگ سے ان کے نصیب جاگے تھے۔ ہزاروں علماء کی اسیری، اذیت اور شہادت اپنی معنویت اور مفہوم کھو بیٹھی۔ اُن کی ہر سعی رائیگاں ٹھہری۔

تحریک آزادی کی جو تاریخ لکھی گئی اس سے وہ انقلابی باب ہی غائب تھا جس میں مولانا قاسم نانوتوی، حافظ ضامن شہید، رشید احمد گنگوہی، شیخ الہند مولانا محمود حسن، عبیداللہ سندھی، حسین احمد مدنی وغیرہم کے نام درج تھے۔

تاریخ آزادی تو یہ بھی بھول گئی کہ شاملی کے میدان میں مولانا قاسم نانوتوی نے کتنی جرأت اور پامردی کے ساتھ انگریزی فوج کا مقابلہ کیا تھا۔ دو دھارا تیغہ بس ان پر چلنے ہی والا تھا کہ اللہ نے ان کی جان بچالی، ان کی گرفتاری کے وارنٹ اور ان کی اذیتوں کی خبر اب کسے ہوگی — تاریخ تو حضرت حافظ ضامن شہید کی شہادت بھی فراموش کر چکی ہے جن کے شکم مبارک میں انگریزی فوج کے سپاہی کی گولی اُتر گئی تھی اور ان کی تڑپتی لاش کو حضرت رشید احمد گنگوہی نے اپنے کندھے پر اٹھا کر مسجد تک پہنچایا تھا — تاریخ کو شیخ الہند اسیر مالٹا مولانا محمود حسن کی تحریک ریشمی رومال، ان کی سیاسی جدوجہد، ان کی اسیری اور اذیت سے بھی آگہی نہیں ہے۔ اس انقلابی مجاہد کو تاریخ نے بھلا دیا جس کے بارے میں یوپی کے گورنر سر جیمس میسٹن نے کہا تھا کہ ''اگر اس شخص کو جلا کر خاک بھی کر دیا جائے تو وہ بھی اس کوچے سے نہیں گزرے گی جس میں کوئی انگریز ہوگا'' اسی کا یہ بھی قول ہے کہ ''اگر اس شخص کی بوٹی بوٹی کر دی جائے تو ہر بوٹی سے انگریزوں کی عداوت ٹپکے گی۔'' مولانا حسین احمد مدنی کی نو سال کی اسیری اور اذیت بھی شاید اب کسی کو یاد ہو۔

تحریک آزادی کی تاریخ کو یہ دلدوز، جاں سوز باب یاد نہیں ہے۔ بس یاد ہے تو صرف اتنا کہ ملک کی تقسیم کا ذمہ دار محمد علی جناح ایک مسلمان تھا — کتنی ہوشیاری سے ایک جزو کو کل میں تبدیل کر دیا گیا اور اُس کل کو بھلا دیا گیا جس پر علماء اور اہل اسلام کا ایمان تھا اور جس کی خاطر ان کا جبہ و دستار بھی بے وقار ہوا۔

قطرہ میں دجلہ دیکھنے کی اس منطق نے مجاہدین آزادی اور محب وطن مسلمانوں کو مشکوک و مشتبہ بنا دیا۔ گورنر ہند لارڈ ایلن برا نے ۱۸۴۳ء میں جو لکھا تھا کہ ''مسلمانوں کی قوم اصولاً ہماری دشمن

ہے'' ۱۹۴۷ء کے بعد وہی عبارت اکثریتی طبقے کے مٹھی بھر جنونی لوگوں نے اقلیت کی پیشانی پر لکھ دی۔ جب کہ اقلیت اور اکثریت کے درد مشترک رہے ہیں اور یہ انسانی بنیادوں پر بنی مذہب کے پیغام امن وانسانیت پر عمل پیرا بھی ہیں۔ دونوں طبقہ ادغام نہیں احترام مذاہب پر یقین رکھتا ہے۔مگر دونوں طبقے کے مٹھی بھر لوگوں کے غلبے کی وجہ سے ہندومسلم رشتے کی منطق الجھتی جارہی ہے اور قومی اتحاد کی معنویت مجروح ہوتی جارہی ہے۔ آج مبتلائے محن مسلمان یہ کہنے کی قوت بھی کھو چکا ہے:

ہم بڑی چیز سمجھتے تھے یہ بے خانے میں نکلا اک جام کی قیمت بھی نہ ایماں اپنا

اکثریت کو آزادی مل گئی مگر اقلیت کو ابھی تک آزادی کا انتظار ہے کہ:

وہ انتظار تھا جس کا وہ سحر نہیں آئی

جاں نثار اختر نے بڑا اچھا سوال اٹھایا ہے:

ہند صدیوں کی غلامی سے تو آزاد ہوا
تم بھی آزاد ہوئے اہل وطن سے پوچھو

دیوبند کے مآثر ومعارف

ہندوستان کی سیاسی تاریخ سے دیوبند کا نام حذف کردیا گیا۔مگر ہندوستان کی علمی، ثقافتی، تہذیبی تاریخ میں اس کے نقوش اتنے روشن ہیں کہ اس میں ترمیم وتنسیخ کے سارے امکانات بھی معدوم ہوگئے ہیں۔

دیوبند کی ایک زریں علمی تاریخ ہے اور یہ ادارہ علمی بنیاد پر ہندوپاک کے عربی جامعات اور اسلامی مطالعات کے اداروں میں نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ اسلامیان ہند کے دلوں کی دھڑکن اور آرزوؤں کی آماجگاہ ہے۔ بقول مولانا ابوالکلام آزاد ''صحیح معنی میں اسلامی تعلیمات کی ایک بین الاقوامی یونیورسٹی ہے'' جس کی روشن خدمات سے دنیا کا کوئی بھی خطہ خالی نہیں ہے جس کے علمی روحانی اثرات عجم سے عرب تک پڑے ہیں۔ جس نے ملت اسلامیہ کی مضمحل روح کو تقویت عطا کی، جس نے مسلمانوں کی گم شدہ میراث کا احیاء کیا اور قوم کی رگوں میں نئی زندگی دوڑا دی۔ علوم دینیہ کا احیاء اگر دیوبند نے نہ کیا ہوتا تو ہندوستان میں مسلمانوں کا علمی زوال یقینی تھا۔

علماء دیوبند تعلیمی محاذ پر مستحکم نہ ہوتے تو یہاں تفرنج اور دہریت کا غلبہ ہوتا۔ یہاں کے علماء نے صرف اشاعتِ دین کا بیڑا نہیں اٹھایا بلکہ مختلف علوم وافکار، فنون وادبیات میں گراں قدر کارنامے انجام دیئے کہ آج پوری دنیا دیوبند کے علمی وقار اور امتیاز کا اعتراف کرتی ہے۔

علوم و معارف کا کوئی ایسا گوشہ نہیں ہے جسے علماء دیوبند نے تشنہ چھوڑا ہو۔ علوم شرعیہ ہو کہ عقلیہ، علم نحو، صرف، لغت، بلاغت، بیان و بدیع، فقہ، حدیث، تفسیر، تاریخ، تصوف، کلام، منطق، ریاضی، ہندسہ، ہیئت، حیوانیات، نجوم، طب، فلکیات — علوم کی تمام شاخوں میں علماء دیوبند کی خدمات مسلم ہیں۔ سائنسی علوم اور تقابلی مذاہب کے ضمن میں بھی دیوبند کی حیثیت امتیازی ہے۔ عربی، فارسی، اردو، بنگلہ، پشتو، کشمیری، مراٹھی، گجراتی اور دیگر علاقائی زبانوں میں لکھنے والے فضلاء کی ایک بڑی تعداد ہے۔

دیوبند سے وابستہ مصنفین کی علمی عظمت و رفعت کی گواہ مختلف علوم و فنون پر لکھی گئی کتابیں ہیں جو نہایت محنت، مشقت، جامعیت اور منطقی ترتیب کے ساتھ لکھی گئی ہیں اور تمام موضوعات کے مالۂ و ماعلیہ پر جس گہری نظر اور بصیرت کا ثبوت علماء دیوبند نے دیا ہے، علمی تاریخ میں اس کی مثال خال خال ہی ملتی ہے۔

علماء دیوبند کے فکری اور علمی تنوعات کا اعتراف صاحبانِ تحقیق اور اربابِ نظر نے بھی کیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ تصنیف و تالیف کے میدان میں دیوبند کا کوئی سہیم و شریک نہیں ہے۔ تنہا مثال مولانا اشرف علی تھانوی کی کافی ہے جن کی تصنیفات کی تعداد ہزار سے زائد ہے اور ہر تصنیف ان کے تبحر علمی کی گواہی دیتی ہے۔

ابن الندیم کی 'الفہرست' اور چلپی کی 'کشف الظنون' کی طرح مختلف علوم و فنون سے متعلق قاموس الکتب تیار کی جائے تو دیوبند یقیناً سرفہرست ہوگا، کیونکہ دیوبند کا تصنیفی دائرہ متنوع بھی ہے اور مختلف فنی فکری جہات کو محیط بھی۔

۱

قرآنی علوم اور متعلقات کے ضمن میں ''ترجمہ شیخ الہند'' (محمود حسن) بیان القرآن (اشرف علی تھانوی) تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن، تفسیر ثنائی (ثناء اللہ امرتسری) معارف القرآن (مفتی محمد شفیع) فہم قرآن (سعید احمد اکبرآبادی) قصص القرآن (حفظ الرحمٰن سیوہاروی) مشکلات القرآن (انور شاہ کشمیری) اعجاز القرآن (شبیر احمد عثمانی)، قاموس القرآن (قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی) تدوین قرآن (مناظر احسن گیلانی)، تفصیل البیان (شمس العلماء مولانا سید ممتاز علی)، قابل ذکر ہیں۔ ان میں موخر الذکر کی تصنیف 'تفصیل البیان' اس اعتبار سے نہایت اہمیت کی حامل ہے کہ یہ قرآنی آیات اور موضوعات کا وضاحتی اشاریہ ہے۔ سات حصوں پر مشتمل اس کتاب کی اہمیت کا اعتراف

مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، سید سلیمان ندوی، انور شاہ کشمیری جیسے کبار علماء نے کیا ہے۔ پانچ ہزار سے زائد عنوانات کے تعین اور قرآنی موضوعات کی تقسیم و تبویب کا یہ کام اتنا اہم ہے کہ مولانا عبدالمجید سالک کی روایت کے مطابق سید امین الحسینی، مفتی اعظم فلسطین نے فرمایا کہ ایسی کتاب عرب دنیا میں بھی موجود نہیں، انہوں نے آگے لکھا ہے کہ ''نجوم الفرقان، فتح الرحمٰن'' وغیرہ موجود ہیں جن کا فائدہ صرف اس قدر ہے کہ ایک لفظ بھی یاد ہو تو آیت کا پتہ چل جاتا ہے، لیکن مسائل کی فہرست اور پھر ہر مسئلے کے متعلق تمام آیات کی یکجائی یہ خوبی عربی زبان کی کسی کتاب میں موجود نہیں ہے۔ اس کتاب کو عربی میں بھی چھاپنا چاہئے۔ (عبدالمجید سالک، یارانِ کہن)

صرف اردو یا عربی میں ہی نہیں بلکہ دیگر علاقائی زبانوں میں بھی علماء دیوبند نے قرآنیات میں غیر معمولی اضافہ کیا۔ قرآن شریف کا پہلا کشمیری ترجمہ اور تفسیر دیوبند کے ہی فاضل مولانا محمد یوسف شاہ کشمیری میر واعظ نے کیا۔ بنگلہ میں حضرت مولانا طاہر اور پشتو میں مولانا سید انوارالحق کا کاخیل نے کیا۔ جب کہ آسامی میں مولانا عبدالحق آسامی، سندھی میں مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی نے قرآن کی تفسیر تحریر کی اور شیخ الہند کے ترجمے کو مولانا سید ارشد مدنی نے ہندی میں ڈھالا۔

۲

علم حدیث، دیوبند کا میدانِ اختصاص ہے۔ علم حدیث اور متعلقات کی اتنی وقیع خدمت دیوبند نے کی ہے کہ صرف صحاحِ ستہ کی شروحات اور حواشی کی تفصیل دی جائے تو ایک طویل مقالہ تیار ہو جائے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے فضلاء دیوبند نے حدیث کے تمام متعلقات پر تفصیل سے لکھا۔ حتی کہ انساب، رجال اور اسانید پر بھی کتابیں لکھیں اور کوئی بھی گوشہ ترک نہیں کیا اور آج بھی حدیث پر تحقیق و تخریج اور تعلیق و تہذیب کا کام جاری ہے۔ یہیں کے ایک فرزند مصطفیٰ الاعظمی نے حدیث کو کمپیوٹرائز کیا۔ عصرِ جدید میں حدیث کی یہ سب سے بڑی خدمت ہے۔

حدیث اور متعلقات حدیث کے تعلق سے چند کتابیں جو قابل ذکر ہیں، ان کے نام کچھ یوں ہیں۔ فیض الباری لحل صحیح البخاری (انور شاہ کشمیری) فضل الباری شرح صحیح بخاری (شبیر احمد عثمانی) انوار الباری شرح صحیح بخاری (احمد رضا بجنوری) الیضاح البخاری (فخر الدین احمد) تحفۃ القاری لشرح صحیح البخاری (عربی، انیس جلدیں — مولانا شبیر احمد از ہر میرٹھی) اقوم المسالک شرح موطا مالک (شبیر احمد از ہر میرٹھی) شرح مسند احمد بن حنبل، سولہ جلدیں — شبیر احمد از ہر میرٹھی)، فتح الملہم شرح صحیح مسلم (شبیر احمد عثمانی) شرح مقدمہ مسلم (نعمت اللہ اعظمی) شرح مقدمہ مسلم (سعید احمد پالن پوری)

العرف الشذی علی جامع الترمذی (انور شاہ کشمیری) تقریر الترمذی (محمد حسن دیوبندی) معارف السنن شرح جامع ترمذی (یوسف بنوری) معارف مدنیہ شرح ترمذی (حسین احمد مدنی) شرح ترمذی (ابراہیم بلیاوی)، التعلیق المحمود (فخر الحسن گنگوہی) التعلیق الصبیح شرح مشکوٰۃ المصابیح (ادریس کاندھلوی) مظاہر حق جدید شرح المشکوٰۃ (عبداللہ جاوید) درس ترمذی (تقی عثمانی) کتاب العلل (مصطفیٰ الاعظمی) کتاب الزہد والرقاق (حبیب الرحمٰن اعظمی) مصنف عبدالرزاق (حبیب الرحمٰن اعظمی) اعلاء السنن (ظفر احمد عثمانی) قلائد الازہار شرح معانی الآثار للطحاوی (مفتی مہدی حسن)

۳

علماء دیوبند نے فقہیات کے سرمایہ میں گراں قدر اضافے کئے ہیں۔ ۱۲ویں صدی میں لکھی جانے والی برہان الدین مرغینانی کی کتاب "الہدایہ" جو مسلم قانون کی سب سے اہم کتاب سمجھی جاتی ہے۔ علماء دیوبند نے اس کی شروحات لکھ کر عام اردو داں کے لیے بھی اس کی تفہیم آسان کر دی ہے۔ اس کے علاوہ قدوری، کنز الدقائق، شرح وقایہ، نورالایضاح کی شروحات اور حواشی کی بھی تعداد خاصی ہے۔ اردو کے فقہی ادب میں مولانا اشرف علی تھانوی کی کتاب 'بہشتی زیور' کو جو مقبولیت اور مرجعیت نصیب ہوئی، دوسری کتابوں کی تقدیر اتنی تابندہ نہ ہوسکی۔ کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ بنگلہ زبان میں اس کا ترجمہ دیوبند کے فاضل، بنگلہ کے عظیم مصنف مولانا شمس الحق فرید پوری نے کیا ہے۔ اسلامیات کے جید فاضل پروفیسر مشیر الحق (شہید) سابق وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی کے مطابق لوگ اپنی بیٹیوں کے جہیز میں قرآن مجید کے ساتھ ساتھ 'بہشتی زیور' بھی دیتے تھے۔ (برصغیر میں فقہ اسلامی کے ارتقاء کا ایک جائزہ، مشمولہ: ہندوستان میں اسلامی علوم و ادبیات، مرتبہ، عماد الحسن آزاد فاروقی)۔

دیوبند کے علماء نے روزمرہ پیش آنے والے مسائل کے تعلق سے بھی آگہی کا ثبوت دیا ہے، اور عصری مسائل کا حل قرآن وسنت کی روشنی میں نکالنے کی کوشش کی ہے۔ علماء دیوبند کی اجتہادی بصیرت کا ثبوت وہ مجموعہ فتاوی ہیں جن میں انسانی سماج کو درپیش روزمرہ کے تمام تر مسائل اور جزئیات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ فتاوی رشیدیہ (رشید احمد گنگوہی) امداد الفتاویٰ (اشرف علی تھانوی) فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ۱۲ جلدیں (ظفیر الدین مفتاحی) نظام الفتاویٰ (نظام الدین) کفایت المفتی (کفایت اللہ دہلوی) عزیز الفتاویٰ (عزیز الرحمٰن عثمانی) جواہر الفقہ (شفیع دیوبندی) فتاوی محمودیہ (مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ) کتاب الحجۃ (عربی، تعلیق وتہذیب مفتی مہدی حسن) قابل ذکر ہیں۔

بعض اہم فقہی مسائل اور مختلفات پر علماء دیو بند نے نہایت مبرہن اور مدلل کتابیں لکھی ہیں اور فقہی تناظرات کو مزید وسعت عطا کرنے کے لئے عصر جدید کے پیچیدہ مسائل ومباحث پر اپنی تصنیفات کے ذریعے عوام الناس کی مشکلات کے ازالہ کی کوشش کی ہے۔ 'آلات جدیدہ کے شرعی احکام، مفتی محمد شفیع دیو بندی کی ایسی ہی ایک اہم کتاب ہے۔ بینک انشورنش، سرکاری قرضہ کے تعلق سے جہاں مولانا برہان الدین سنبھلی نے وقیع کتاب لکھی وہیں سعید احمد اکبرآبادی نے 'ہندوستان کی شرعی حیثیت' عبدالصمد رحمانی نے 'ہندوستان اور مسئلۂ امارت' تحریر کیا۔ اس ذیل میں ابوالمحاسن مولانا محمد سجاد کا ذکر بھی ناگزیر ہے جنہوں نے نہایت اہم فقہی مسائل پر کتابیں لکھیں اور بعض قضایا تحریر کئے۔ اس کے علاوہ جدید فقہی مسائل پر خالد سیف اللہ رحمانی اور قاضی مجاہد الاسلام قاسمی کی کتابیں خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ امارتِ شرعیہ پٹنہ کے فقہی مجلّہ ''بحث ونظر'' کا ذکر بھی ضروری ہے کہ یہ آج کے جدید فقہی مباحث اور مسائل کے لیے مختص ہے۔

٤

منطق ابن تیمیہ (م ۷۲۸ھ) صاحب ''الرد علی المنطقیین'' اور امام غزالی (م ۵۱۵ھ) صاحب ''تہافتہ الفلاسفہ'' کی نظر میں دین مخالف ہے مگر ابن رشد نے ''تہافتہ التہافت'' لکھ کر منطق کی ضرورت اور افادیت پر زور دیا ہے اور حقیقت یہی ہے کہ منطق ہر عہد کی ضرورت ہے۔

دیو بند میں بھی منطق کی بابت دو طرح کے رویے ملتے ہیں۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی کا منطق و فلسفہ پر زور تھا۔ جب کہ حضرت کے معاصر مولانا رشید احمد گنگوہی، دیو بند کے نصاب تعلیم سے منطق کے کلی اخراج کے حق میں تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ انگریزی اس منطق وفلسفہ سے بہتر ہے کہ اس سے دنیا کے نفع کی امید تو ہے۔

دیو بند نے فن منطق و فلسفہ میں بھی یکتائے روزگار علماء پیدا کئے جنہوں نے منطق کی اہم کتابوں 'المرقاۃ' (عبدالحق خیرآبادی) 'قطبی' (قطب الدین رازی) 'سلم العلوم' (ملا محب اللہ بہاری) کی شروحات اور حواشی تحریر کئے ہیں۔

علامہ ابراہیم بلیاوی (م ۱۳۸۷ھ) اور مولانا محمد حسین بہاری اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں۔ علامہ ابراہیم بلیاوی نے قاضی محب اللہ بہاری کی شہرہ آفاق ''سلم العلوم'' کی شرح بعنوان ''ضیاء النجوم'' بھی لکھی ہے اور فارسی میں منطق اور فلسفہ سے متعلق ''انوارالحکمت'' کے نام سے کتاب بھی تحریر کی۔ مولانا ماجد علی جون پوری کا شمار بھی معقولات کے جید عالموں میں ہوتا ہے۔

۵

دیگر علوم عقلیہ میں علم الہیت، فلکیات، علم الحساب، اصطرلاب میں بھی دیوبند کے علماء کا حصہ رہا ہے۔نصیر احمد خاں شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کی کتاب "رسالہ فتحیہ" علم ہیئت کی اہم کتاب تصور کی جاتی ہے، دیوبند کے ہی صدر المدرسین مولانا سید احمد دہلوی کا ریاضی میں یوروپ تک شہرہ تھا۔ ریاضیات اور فلکیات میں وہ عدیل و بےنظیر تھے۔ اسی طرح مولانا عبدالمجید سنبھلی بھی ہیئت اور معقولات کے اتنے ماہر تھے کہ بخارا سے طلباء ہیئت کی تحصیل کے لیے ان کے پاس آتے تھے۔

٦

'علم الادیان' کے علاوہ علم الابدان پر بھی دیوبند کے علماء کا خصوصی ارتکاز رہا ہے۔ یہاں طب وحکمت کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ دیوبند کے فیض یافتہ بہت سے حکماء مرجع خلائق بھی رہے ہیں۔ ان میں لقمان الملک حکیم عبدالوہاب عرف نابینا کا نام نمایاں ہے جنہوں نے دیوبند سے فراغت کے بعد دہلی کے مشہور حکیم محمود خاں سے طب کی تحصیل کی اور مرض کی تشخیص کا ایک نیا طریقہ نکالا۔ نابینا ہونے کی وجہ سے وہ چہرے اور بول و براز کے ذریعے مرض کی تشخیص سے قاصر تھے۔ اس لیے انہوں نے نبض کے ذریعے مرض کی تشخیص کی۔ اس سلسلے میں ان کی کتاب 'اسرار شربانیہ' نہایت وقیع اور طب میں اہمیت کی حامل ہے۔ حکیم عبدالوہاب غازی پوری، ممتاز سیاسی قائد جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے چانسلر اڈنبرا (اسکاٹ لینڈ) کے پڑھے ہوئے، ڈاکٹر مختار احمد انصاری (۱۸۸۰-۱۹۳۶ء) کے برادر بزرگ تھے۔

مولانا قاسم نانوتوی کے تلمیذ رشید مولانا فخرالحسن گنگوہی بھی اپنے عہد کے ممتاز طبیب تھے۔ حکیم محمود خاں اعظم کے شاگرد تھے۔ مولانا فخرالحسن اپنے استاد حکیم محمود خاں اعظم کے ایما پر کانپور گئے۔ چنانچہ محل میں موتی لال نہرو کے رفیق مولوی عبدالجلیل وکیل کے یہاں قیام کیا۔ ان کے طب کی شہرت نے کروڑ پتی جگی لال (پدم پت سنگھانیہ کے جدِ امجد) اور مشہور وکیل پنڈت پرسی ناتھ جیسے لوگوں کو جہاں گرویدہ بنا دیا وہیں کانپور کو مستقر بنانے پر مجبور بھی کیا۔ مولانا بہت اچھے نباض تھے اور ان کے ہاتھ میں شفا بھی تھی۔ جب پورا کانپور ہیضے کی زد میں تھا، اموات کا سلسلہ تھا کہ رکنے کا نام نہ لے رہا تھا۔ اُس وقت مولانا فخرالحسن نے ہیضے کے لیے ایک ایسا تیر بہدف نسخہ تیار کیا کہ نوّے فیصد افراد کو شفائے کلی حاصل ہوئی۔

حکیم رحیم اللہ بجنوری بھی دیوبند کے فیض یافتہ تھے جنہوں نے حکیم ابراہیم لکھنوی سے طب

کی تکمیل کی۔ بہت سی کتابوں کے مصنف بھی تھے اور طب کے ذریعے انسانیت کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ حکیم محمد اسحاق کٹھوری نے بھی دیوبند سے فراغت کے بعد حکیم عبدالمجید خاں دہلوی اور حکیم عبدالعزیز خاں لکھنوی سے علوم طب کی تکمیل کی۔ انہوں نے نبض شناسی پر ایک ضخیم کتاب لکھی تھی جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔

دیوبند ہی کے فارغ حکیم جمیل الدین بجنوری اپنے وقت کے ممتاز طبیب تھے جن کے شاگرد مسیح الملک حکیم اجمل خاں کو پوری طبی دنیا جانتی ہے۔ یونانی طب کے ماہرین میں حکیم جمیل الدین کا شمار ہوتا ہے۔ دہلی کا مشہور صدیقی دواخانہ ان کی یادگار ہے۔

مولانا سید احمد حسن امروہوی اعلیٰ پایہ کے محدث ہونے کے ساتھ ساتھ حکیم بھی تھے اور طب کی تعلیم دیتے تھے۔ طب میں حکیم امجد علی خاں کے شاگرد تھے۔ مولانا امروہوی کے شاگردوں میں حکیم فرید احمد عباسی کا نام بہت نمایاں ہے۔

V

ادبیات اور لسانیات میں بھی دیوبند کا امتیاز کسی سے مخفی نہیں۔ ادبیات کے فروغ واستحکام میں اس کا نمایاں حصہ رہا ہے۔ بالخصوص عربی زبان کی لسانی وتہذیبی اہمیت کا ادراک دیوبند نے کرایا۔ اس زبان سے رشتہ کو مستحکم بنائے رکھنے کے لیے کافی مساعی کی ہیں۔ دیکھا جائے تو عربی ادبیات کی ترویج، اشاعت، اس کی تفہیم وتعبیر اور توسیع وتفریح میں اس کا اہم کردار رہا ہے۔ قدیم کلاسیکی عربی و جدید عربی ادبیات کے ذخائر کو اردو دنیا سے روشناس کرانے میں بھی دیوبند کا کم حصہ نہیں ہے۔

قدیم کلاسیکی شعری متون سبع معلقات، دیوان الحماسہ، دیوان المتنبی کی شروحات وحواشی کے تعلق سے مولانا اعزاز علی امروہوی، مولانا قاضی سجاد حسین کے نام اہم ہیں کہ مولانا اعزاز علی نے حماسہ اور دیوان متنبی کے حواشی تحریر کیے۔ جب کہ قاضی سجاد حسین نے سبعہ معلقات کی شرح 'توشیحات' کے نام سے تحریر کی اور علم الحیوانات کی مشہور کتاب دمیری کی 'حیاۃ الحیوان' کا دو جلدوں میں ترجمہ مولانا عبدالقدیر دیوبند نے کیا۔ یہ مطبع نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوا جہاں وہ مصحح کے منصب پر فائز تھے۔ جدید عربی ادبیات کے تراجم کے تعلق سے قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی کا نام قابل ذکر ہے کہ انہوں نے مشہور انشاء پرداز اور عربی افسانہ نگار مصطفیٰ لطفی المنفلوطی کے افسانوں اور مضامین کے ترجمے کیے۔ 'موج نیل' اور 'مصری افسانے' ان کی ترجمہ کردہ کتابیں ہیں۔

اس کے علاوہ نظم ونثر کے انتخابات کے ذریعے عربی زبان وادب کو دیوبند نے فروغ دیا

ہے۔ نفحۃ العرب (مولانا اعزاز علی امروہوی) اور القرأۃ الواضحہ (مولانا وحید الزماں کیرانوی) جیسی کتابیں عربی ادب کے طالب علموں کے لئے متاعِ بیش بہا کی حیثیت رکھتی ہیں کہ انہیں کے ذریعے طلباء میں عربی کا ذوق بالیدہ ہوا اور لسانی شعور بیدار۔ بنیادی لسانی تربیت میں دیوبند کے علماء کی کتابوں کا کردار نہایت اہم رہا ہے۔

یوں تو دیوبند کے علماء نے عربی نثر کے قدیم آہنگ کو اختیار کیا اور بہت سی کتابیں تصنیف کیں مگر خالص ادبی نقطۂ نظر سے بھی بہت سی مصنفات قابلِ ذکر ہیں۔

مولانا اعزاز علی امروہوی کا شمار عربی کے بہترین نثر نگاروں میں ہوتا ہے۔ انہیں شیخ الادب کا خطاب، عربی میں مہارت، حذاقت اور براعت کی وجہ سے ہی ملا تھا۔ مولانا نجم الدین جہلمی اورینٹل کالج لاہور کے استاد تھے۔ عربی ادب میں ان کا نام بہت نمایاں ہے۔ جدید دور میں عربی لکھنے والوں میں وحید الزماں کیرانوی، بدرالحسن قاسمی، مولانا نور عالم خلیل الامینی، ابوبکر غازی پوری، راشد علی علوی محمد ولی رحمانی، عمید الزماں کیرانوی، زبیر احمد فاروقی، ڈاکٹر مظہر بقا، ابوالعاص وحیدی، اسلام القاسمی، اسعد الاعظمی، مزمل الحق الحسینی، خالد القاسمی اور ندیم الواجدی کے نام نمایاں ہیں۔

عربی شعر و ادب میں بھی مولانا محمد قاسم نانوتوی، حبیب الرحمٰن عثمانی (قصیدہ لامیۃ المعجزات)، انور شاہ کشمیری، اعزاز علی امروہوی، مفتی محمد شفیع، عبدالحق مدنی، ذوالفقار علی دیوبندی اور ادریس کاندہلوی، قاری فصیح احمد بہاری (جن کے صاحبزادے پروفیسر ظفر اوگانوی مرحوم اردو کے ممتاز افسانہ نگار تھے)، کا نمایاں حصہ ہے۔

اس کے علاوہ دیوبند سے ''دعوۃ الحق'' نامی عربی مجلّے کا اجرا ہوا جس کے مدیر وحید الزماں کیرانوی تھے۔ یہ رسالہ ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۵ء تک شائع ہوتا رہا۔ اُس کے بعد جون ۱۹۷۶ء میں ''الداعی'' کا اجرا ہوا جس کی ادارت کے فرائض بدرالحسن قاسمی نے بھی انجام دیئے ہیں۔ یہ دارالعلوم دیوبند کا ترجمان ہے اور مختلف مذہبی، سیاسی موضوعات اور افکار و آثار اسلاف پر محیط یہ عربی مجلّہ عالمِ عرب میں بھی مقبول ہے۔ مولانا نور عالم خلیل الامینی اس رسالے کے مدیر ہیں جو اپنے اداریئے میں عالمِ عرب کی سیاسی، سماجی صورتِ حال پر بھی بصیرت افروز تجزیئے لکھتے رہتے ہیں اور ان کا ''اشراق'' کافی معلوماتی اور ادبیت سے بھرپور ہوتا ہے۔

۸

فارسی ادبیات کو بھی اردو داں طبقے سے روشناس کرانے میں دیوبند کا کردار ناقابلِ فراموش

ہے۔ مولانا قاضی سجاد حسین کرت پوری نے نہ صرف مثنوی مولانا روم کا ترجمہ کیا بلکہ دیوان حافظ کا ایسا سلیس اور فصیح ترجمہ کیا کہ اسی ترجمے کی اساس پر اردو کے نقاد حافظ کا حوالہ دیتے ہیں اور ان کی لفظیات وفکریات سے استفادہ کرتے ہیں۔ شیخ سعدی کی ''گلستاں بوستاں''، ''مالا بدمنہ''، ''گلزار دبستاں'' اور ''پند نامہ'' پر ان کے حواشی مفید خواص وعوام ثابت ہوئے۔ فارسی کے ایک متبحر عالم کی حیثیت سے ان کی شناخت مسلم ہے اور اس کا اعتراف حکومت ہند نے فارسی کے اعزاز سے سرفراز کر کے کیا ہے۔

۹

لغت نویسی، فرہنگ سازی نہایت وقت طلب کام ہے۔ اس کے لئے زبانوں پر مہارت اور محاورات پر عبور ضروری ہے۔ دیوبند اس میدان میں بھی گوئے سبقت لے گیا۔ عبدالحفیظ بلیاوی کی ''مصباح اللغات'' قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی کی 'بیان اللسان'، ''قاموس القرآن'' اور وحید الزماں کیرانوی کی ''القاموس الجدید'' ایسی لغات ہیں جن سے کوئی صرف نظر نہیں کرسکتا۔ عربی ادب کے طلباء اور اساتذہ کے لئے ان لغات سے مفر نہیں۔ بالخصوص مترجمین کے لئے یہ لغات ناگزیر ہیں۔

دیوبند کے فضلاء اور عصری جامعات

دیوبند کا اسلامی علوم وادبیات پر زیادہ زور تھا۔ مگر عصری علوم یا دیگر اقوام کی زبانوں کی تحصیل سے بھی گریز نہیں کیا۔ حضرت شاہ عبدالعزیز نے انگریزی پڑھنے کو جائز قرار دیا تھا اور مولانا رشید احمد گنگوہی نے بھی اس کے مشروط جواز کا فتوی دیا تھا کہ ''انگریزی زبان سیکھنا درست ہے بشرطیکہ کوئی معصیت کا مرتکب نہ ہو اور نقصان دین میں اس سے نہ آئے۔'' دیوبند نے عصری علوم والسنہ کے دروازے بند نہیں کئے۔ بلکہ حضرت مولانا قاسم نانوتوی نے تو یہاں تک کہا ''دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی نصاب سے فارغ ہونے کے بعد اگر طلبہ مدرسہ ہٰذا مدارس سرکاری میں جا کر علوم جدیدہ کو حاصل کریں تو ان کے کمال میں یہ بات زیادہ موید ثابت ہوگی۔''

انہوں نے یہ بھی فرمایا ''مولویوں میں کوئی شخص علمی کمالات میں مزید فروغ اور زیادہ وزن پیدا کرنا چاہتا ہے تو اس کو چاہئے کہ یورپ کے جدید علوم وفنون کا مطالعہ کرے۔ ان کی علمی زبان سیکھے جو سرکاری مدارس میں سکھائی جاتی ہے۔''

علماء دیوبند نے انگریزی کی مخالفت بھی زبان سے نفرت نہیں بلکہ انگریز استعماریوں کی خفیہ سازشی ذہنیت کی وجہ سے کی تھی جو زبان کے وسیلے سے دل و دماغ پر اثر انداز ہونا چاہتی تھی۔ اس کی وجہ اکبرالہ آبادی کی زبان میں محض یہ تھی:

دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

حضرت شیخ الہند نے اپنے خطبے میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا کہ ''میرے بزرگوں نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم و فنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا۔ ہاں یہ بے شک کہا کہ انگریزی تعلیم کا آخری اثر یہی ہے جو عموماً دیکھا گیا ہے کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگے جائیں گے یا ملحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب والوں کا مذاق اڑائیں گے۔''

اکبرالہ آبادی نے اسی احساس کو شعری اظہار میں یوں ڈھالا ہے:

علوم دنیوی کے بحر میں غوطے لگانے سے
زباں گو صاف ہوجاتی ہے دل طاہر نہیں ہوتا

علماء کا خدشہ غلط نہیں تھا۔ گلوبلائزیشن نے اس خدشے کو حقیقت میں تبدیل کر دیا ہے کہ اس کے ذریعے جس نوآبادیاتی ذہن کی تشکیل کی جارہی ہے اس کے مضرات اور منفی اثرات سے ملک کا ثقافتی، تہذیبی، لسانی ڈھانچہ ہی منہدم ہوتا جارہا ہے۔ مظفر حسین نے اپنے ایک مضمون میں مشہور ماہر لسانیات اینڈریو ڈیلی کی کتاب "Language in Danger" کے حوالے سے اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ ''اکیسویں صدی ختم ہوتے ہوتے قریب پچیس سو زبانیں دم توڑ دیں گی۔ مصنف کا کہنا ہے کہ اس معاملے میں زبانوں کا سب سے بڑا دشمن گلوبلائزیشن کا عمل ہے۔ ساری دنیا ایک ہوجائے، یہ تصور صرف ایک زبان کو زندہ رکھنے کے لئے پیش کیا گیا ہے۔ جب زبان ایک ہوگی تو اس کا نظریہ اور اس کی تہذیب اس خطے پر مسلط کر دی جائے گی۔۔۔ آج ہمیں جس گلوبلائزیشن کی تعلیم دی جارہی ہے وہ صرف دنیا میں ساز و سامان کے تبادلے تک ہی محدود نہیں رہنے والی ہے بلکہ اُس گلوبلائزیشن کے نام پر دوسری زبانوں کے پہچان کو ختم کر دیا گیا ہے۔۔۔ اس وقت دنیا میں ایک ارب آٹھ کروڑ لوگ انگریزی کا استعمال کر رہے ہیں۔ انگریزی کے حامی سائنس اور گلوبلائزیشن کے نام پر ساری دنیا کو انگریزی کے رنگ میں رنگ دینا چاہتے ہیں۔ انگریزی سلطنت جہاں جہاں گئی اپنی زبان ساتھ لے کر گئی۔ اُس نے اپنی زبان کو اتنی عزت دی کہ نوآبادیات میں رہنے والا ہر شخص انگریزی پڑھنے اور سیکھنے کے پیچھے پاگل ہوگیا۔۔۔ انگریزی زبان کو امریکی میڈیا اور ملٹی نیشنل کمپنیاں پوری دنیا میں پھیلانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اس سے دیگر ممالک کی زبان اور وہاں کا کاروبار

خطرے میں پڑ رہا ہے۔ (اُردو نامہ، پٹنہ، شمارہ نمبر:۱۵۱)

اس خطرے اور خدشہ کے باوجود دیوبند کے بہت سے فضلاء نے عصری جامعات کا رخ کیا اور اعلیٰ سطح کی ڈگریاں حاصل کیں۔ علوم عصریہ اور السنہ غربیہ سے آگاہ ایسے فضلاء دیوبند میں ڈاکٹر عبدالعلی لکھنوی کا نام اس طور پہ ممتاز ہے کہ انہوں نے لکھنؤ میڈیکل کالج سے .M.B.B.S کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی۔ شیخ الہند اور علامہ انور شاہ کشمیری سے صحاح ستہ کی تحصیل کے بعد انہوں نے انگریزی تعلیم کی طرف رخ کیا۔ کیننگ کالج لکھنؤ سے B.SC کیا۔ ڈاکٹر عبدالعلی، صاحب نزہتہ الخواطر مولانا حکیم سید عبدالحی کے بڑے صاحبزادے اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے برادر کلاں تھے۔ مولانا سعید اکبرآبادی نے بھی دیوبند سے فراغت کے بعد مشہور سینٹ اسٹیفن کالج سے ایم۔ اے کیا اور کچھ دنوں وہیں لیکچرر رہے۔ بعد میں شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ناظم ہوئے۔ اسی طرح مظفر عالم نے دیوبند سے فراغت کے بعد تاریخ میں اپنا امتیاز و اعتبار قائم کیا۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی سے ان کی وابستگی رہی۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی ہی کے پروفیسر عبدالحق، دیوبند کے فیض یافتہ ہیں اور عربی ادب میں امتیازی شناخت رکھتے ہیں اور وہیں کے دراسات ایشیائے غربی سے وابستہ ظہور الباری بھی دیوبند کے فارغ ہیں۔

ان کے علاوہ ایک طویل فہرست ہے ایسے افراد کی جنہوں نے عصری جامعات سے فیض حاصل کیا اور اعلیٰ سطح کی ڈگریاں حاصل کیں۔ گوکہ بیشتر فضلاء دیوبند کا رشتہ عصری جامعات میں بھی السنہ شرقیہ اور علوم شرعیہ سے ہی رہا۔ ایسے فضلاء دیوبند میں مصطفیٰ اعظمی (کیمبرج: دراسات فی الحدیث النبوی) ڈاکٹر مظہر بقا سرونجی (اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ، کراچی یونی ورسٹی، کراچی)، ڈاکٹر عبدالصبور قاسمی، ڈاکٹر مصطفیٰ حسن علوی (ملک شاہ سلجوقی اور اس کا عہد)، ڈاکٹر زبیر احمد فاروقی، ڈاکٹر عتیق الرحمٰن قاسمی (پٹنہ: علامہ شوق نیموی حیات اور کارنامے) ڈاکٹر رشید الوحیدی (مصر میں جدید عربی شاعری کا ارتقاء ۱۹۰۰-۱۹۵۰ء) ڈاکٹر بدرالدین الحافظ (چند مصری ناول اور افسانے، نجیب محفوظ اپنے نگارشات کی روشنی میں) ڈاکٹر کفیل احمد قاسمی (کتاب الملقی التبریزی کی تنقیدی تدوین) ڈاکٹر عبدالرشید صدر شعبہ عربی پٹنہ یونیورسٹی (طبقات الشافعیہ کی تدوین) ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی، (مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت)، ڈاکٹر عقیل احمد صدیقی، ڈاکٹر اعظم قاسمی، ڈاکٹر محمد ظہور الحق، ڈاکٹر یوسف خاں اور ڈاکٹر عبدالصمد صارم ازہری و عبدالحلیم چشتی، ڈاکٹر شمس تبریز خاں کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالقیوم قاسمی نے بھی کولمبیا یونیورسٹی سے اردو پشتو اور پنجابی تحریرات کی فہرست سازی کا ضابطہ اور ڈاکٹر رشید احمد جالندھری نے کیمبرج سے ڈاکٹریٹ کی

ڈگریاں حاصل کی ہیں۔

اس عظیم علمی ادارے کی ضوفشانی صرف ہندوستان تک محدود نہیں ہے بلکہ غیر ممالک روس، چین، جنوبی افریقہ، سعودی عرب، عراق، ایران، کویت، انڈونیشیا، ملیشیا، برما، یمن، کمبوڈیا، تھائی لینڈ، سیام، سری لنکا، افغانستان، بنگلہ دیش، پاکستان اور نیپال کے طلباء بھی اکتساب نور کرتے رہے ہیں۔

دیوبند اور تحقیقی مطالعات

دیوبند کی خدمات کا دائرہ متنوع اور بسیط ہے۔ مختلف جہات پر محیط اس کے جو کارنامے ہیں، وہ یقیناً اس قابل ہیں کہ اُن پر مکمل روشنی ڈالی جائے۔ چنانچہ محققین نے دیوبند کے مختلف ابعاد کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا اور خدماتِ جلیلہ کا اعتراف کیا۔

مختلف پہلوؤں سے دیوبند پر تحقیقی مطالعات کا سلسلہ جاری ہے۔ مسز بار براڈلی میٹکاف نے ۱۹۸۲ء میں ''اسلامک ریوائیول ان برٹش انڈیا: دیوبند ۱۸۶۰-۱۹۰۰ء'' کے عنوان سے نہایت وقیع مقالہ پیش کیا تو پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے میک گل یونیورسٹی کناڈا سے ''دی دیوبند اسکول'' کے نام سے تحقیقی مقالہ لکھا۔ دیوبند کے فارغ التحصیل ڈکتور رشید احمد جالندھری نے کیمبرج یونیورسٹی سے ''دارالعلوم دیوبند، مسلم ایجوکیشن ان برٹش انڈیا اے کریٹیکل ریویو'' کے نام سے انگریزی میں تحقیقی مقالہ لکھا تو جامع ازہر سے ڈکتور رضوان اللہ نے ڈکتور ابراہیم علی شعوط کی زیرِ نگرانی ''دارالعلوم دیوبند واثرہا الاسلامی فی الہند'' کے عنوان سے اور ڈکتور زبیر احمد فاروقی نے ''علمائے دیوبند کی عربی خدمات'' پر عربی میں مقالے تحریر کیے۔

ان کے علاوہ دیوبند کے کبار علماء کے علمی کارناموں پر مشتمل تحقیقی مقالے شائع ہوئے جن میں ڈاکٹر اقبال حسن خاں کی ''شیخ الہند مولانا محمود حسن حیات اور علمی کارنامے''، ڈاکٹر رضوان اللہ کی کتاب ''علامہ انور شاہ کشمیری حیات اور کارنامے'' خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ انوار الحق نے ''مولانا الیاس کی دینی تحریک'' پر تحقیقی مقالہ لکھا تو ڈاکٹر شیخ ولی پاکستان نے علامہ انور شاہ کشمیری اور شبیر احمد عثمانی کا خصوصی مطالعہ اور ڈاکٹر اجمل پروفیسر نفسیات قائد اعظم یونیورسٹی نے مولانا اشرف علی تھانوی کی ملفوظات کا نفسیاتی تجزیہ کیا۔

پاکستانی جامعات میں علماء دیوبند کی خدمات کو تحقیق کا موضوع بنایا گیا اور طلباء نے اپنی ڈاکٹریٹ کی ڈگریوں کے لیے علماء دیوبند کی خدمات کو اپنا موضوعاتی محور بنایا۔ ابھی جو تحقیقی مقالات مکمل ہوئے ہیں اُن میں عبدالقادر آزاد کا تحقیقی مقالہ ''مولانا اشرف علی تھانوی بطور مفسر'' (پی ایچ ڈی،

شعبۂ علوم اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور) محمد اسحاق اظہر کا مقالہ ''مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری کی تفسیری خدمات'' (پی ایچ ڈی شعبۂ علوم اسلامیہ، بھاولپور یونیورسٹی) محمد سعد صدیقی کا ''علم تفسیر میں مولانا ادریس کاندھلوی کی خدمات'' (پی ایچ ڈی، شعبۂ علوم اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور) مدثر احمد کا ''مولانا مفتی محمد شفیع کی دینی و ملی خدمات'' (پی ایچ ڈی، شعبۂ علوم اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور) زیتون بیگم کا علامہ شبیر احمد عثانی اور ان کی کتاب ''فتح الملہم کا تنقیدی جائزہ'' (شعبۂ عربک جامعہ پنجاب، لاہور ۱۹۸۴ء)، غلام محمد تجی کا ''علامہ انور شاہ کشمیری کے کارنامے'' (شعبۂ اسلامیات، جامعہ پنجاب لاہور ۱۹۸۴ء) منیر احمد مغل کا ''مولانا عبید اللہ سندھی کی تفسیر المقام المحمود'' (ثقافت اسلامی وتقابل ادیان، جامعہ سندھ ۱۹۸۰ء) احمد خاں اعوان کا ''تفاسیر سورہ یوسف مولانا عبداللہ لغاری اور مولانا عبید اللہ سندھی کا تقابلی جائزہ'' (ثقافت اسلامی و تقابل ادیان جامعہ سندھ ۱۹۹۱ء)، صلاح الدین ثانی کا ''علمائے دیوبند کی قرآنی خدمات'' (ثقافت اسلامی و تقابل ادیان جامعہ سندھ ۱۹۹۷ء) اور عبدالرحمٰن کوثر کی ''مشائخ دیوبند خدماتهم للحديث'' (ثقافت اسلامی و تقابل ادیان، جامعہ سندھ ۱۹۹۲ء) محمد یونس کی علامہ اقبال اور مولانا اشرف علی تھانوی افکار کا تقابلی جائزہ (ایم۔فل، علامہ اقبال، اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد) قابل ذکر ہیں۔

پاکستان کے ممتاز محقق اور مورخ پروفیسر محمد اسلم کی نگرانی میں دیوبند کے علماء کی خدمات کے تعلق سے ایم۔اے کی سطح پر جامعات میں جو تحقیقی مقالات لکھے گئے ہیں، وہ بھی نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔

(۱) محمد منیر، احوال و آثار مولانا محمد قاسم نانوتوی (۲) سید ناظم ہمدانی، احوال و آثار مولانا شبیر احمد عثانی (۳) نورین خاں، مولانا عبید اللہ سندھی کے سیاسی نظریات (۴) سمیعہ وحید، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، احوال و آثار (۵) محمد نواز، احوال و آثار مولانا رشید احمد گنگوہی (۶) بشیر احمد، مولانا انور شاہ کاشمیری (۷) شگفتہ خاں، دارالعلوم دیوبند کے سو سال (۸) عذرا ناہید، مولانا سعید احمد اکبر آبادی بحیثیت مؤرخ۔

✪✪✪

دارالعلوم دیوبند — ادبی ثقافتی روایت

۱

دارالعلوم دیوبند — تخلیقی تناظرات

اردو کی اساس میں دیوبند کا لہو بھی شامل ہے۔ مگر المیہ یہ ہے کہ اردو ادب کی تاریخ میں لہو کی نہیں، صرف لہو ولعب کی قیمت رہ گئی ہے۔

ریاضت کرنے والوں کو حاشیے میں بھی جگہ نہیں ملتی جب کہ ملاعبت کرنے والے متن میں اعلیٰ مقام اور تاریخ ادبیات اردو میں مفتخر قرار پاتے ہیں۔

اردو ایسی بہت سی ناانصافیوں اور بددیانتیوں کی گواہ ہے۔

اردو زبان کے لسانی اور فکری سرمائے میں جو اضافے ارباب مدارس نے کئے ہیں، وہ اظہر من الشمس ہیں۔ مگر اس کے باوجود اردو کی تاریخ میں دلی، لکھنؤ جیسے دبستانوں کا ذکر تو ملتا ہے مگر دیوبند کا ذکر شامل نہیں ہوتا جب کہ اردو زبان وادب کے فروغ اور ارتقاء میں بنیادی اور اہم کردار دیوبند، ندوہ، ندوۃ المصنفین اور دارالمصنفین جیسے اداروں کا رہا ہے۔ صرف برصغیر نہیں بلکہ بیرون ممالک میں بھی ان اداروں کے فیض یافتہ فضلاء کرام نے اردو کی شمع کو جلائے رکھا اور ان منطقوں کو

بھی اردو سے روشناس کیا جولسانی تہذیبی اعتبار سے اردو سے کلی طور پر مختلف ہیں۔

اس طرح کے بہت سے علاقوں میں اردو مذہبی، سماجی، ثقافتی شناخت کا ذریعہ بھی بن گئی۔ جنوبی افریقہ اس کی نمایاں ترین مثال ہے جہاں اردو کو Riligious Lingua Franca کی حیثیت حاصل ہے۔ پروفیسر حبیب الحق ندوی نے اپنے مضمون ''جنوبی افریقہ میں اردو'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''ڈربن میں پانچ عظیم مراکز ہیں جہاں اردو ذریعۂ تعلیم ہے۔ درجنوں مدارس ہیں جن کے اساتذہ زیادہ تر ہندوستانی مدارس، مثلاً دیوبند، راندھیر اور ڈھابیل کے فارغین ہیں'' ان اساتذہ کی وجہ سے جنوبی افریقہ میں اردو کو فروغ حاصل ہوا۔ اس ضمن میں مولانا محمد الیاس کاندھلوی کی عالمی تبلیغی تحریک کا ذکر بھی ضروری ہے جس نے زبان کی حد تک اردو کے فروغ میں اردو کی باضابطہ تنظیموں، اداروں سے زیادہ فعال اور نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ صرف ایشیا، افریقہ نہیں بلکہ یوروپی ممالک میں بھی اردو کے تہذیبی لسانی چراغ کو روشن رکھا ہے۔ پروفیسر حبیب الحق ندوی کے بقول ''۱۹۶۴ء سے جنوبی افریقہ میں تبلیغی جماعت کی تحریک شروع ہوئی۔ اس کا پہلا اجتماع ۱۹۶۴ء میں شہر ڈربن میں منعقد ہوا۔ ۱۹۷۲ء تک لاکھوں کے مجمعے میں تمام تقاریر اردو زبان میں ہوتی رہیں۔'' اس طور پہ اردو زبان کے فروغ میں تبلیغی جماعت کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ضرورت ہے کہ اردو زبان کے فروغ میں تبلیغی جماعت کے کردار پر تحقیق کی جائے اور ان کی وسیع تر خدمات کا مکمل جائزہ لیا جائے۔

مدارس نے اردو زبان کے احیاء کے لیے عملی اقدامات کیے اور تدریسی میڈیم کے طور پر اردو زبان کو اختیار کیا اور اس طرح اردو زبان کی ترقی کی راہیں ہموار کیں کہ دیگر لسانی معاشروں سے تعلق رکھنے والے بھی اردو زبان میں ہی تعلیم پاتے ہیں۔ چاہے اُن کا تعلق برمی، بنگلہ، کنڑ، تمل، تلگو، گجراتی، مراٹھی زبان سے ہو مگر مدارس کے طلبا اُردو زبان کے ذریعے ہی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس کے برعکس عصری جامعات یا کالجز کے اردو شعبہ جات میں لوگ اردو کو اختیاری یا لازمی مضمون کے طور پر لیتے ہیں مگر مدارس میں ہر سطح پر اردو لازمی ہوجاتی ہے کہ اردو ہی ذریعہ تعلیم ہے۔ اس طرح اردو جاننے والوں کے حلقے میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش میں فاضل دیوبند مولانا اطہر علی جو وہاں کی جمعیۃ العلماء اسلام کے صدر بھی تھے، کشور گنج میں دارالعلوم دیوبند کا مثنیٰ قائم کیا تو وہاں بھی ذریعۂ تعلیم بنگلہ کے بجائے اردو زبان ہی رکھا۔

دارالعلوم دیوبند نے اردو کو بین الاقوامی زبان بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے جس کا اعتراف پروفیسر ہمایوں کبیر بھی کرتے ہیں۔ تاریخ دارالعلوم دیوبند کے حاشیئے میں ایک واقعہ اس تعلق سے الجمعیۃ، دہلی ۱۸رجون ۱۹۵۵ء کے حوالے سے درج کیا گیا ہے کہ ایک صاحب جنہوں نے مختلف

ممالک کی سیاحت کی تھی، دارالعلوم آئے تھے۔ وہ کہتے تھے ''جب میں بخارا پہنچا جو وسط ایشیاء کا اہم مقام ہے تو وہاں ایسے لوگوں سے میری ملاقات ہوئی جنہوں نے مجھے ہندوستانی سمجھ کر ہمدردانہ لہجے میں اردو میں مجھ سے گفتگو کی۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ ہندوستان سے اِس قدر دور دراز، اتنی صاف اردو اُن کو کیونکر آئی ہوگی۔ میرے دریافت کرنے پر انہوں نے یہ بتلایا کہ یہ دارالعلوم دیوبند کا تعلیمی فیض ہے اور ہم ہی نہیں بلکہ یہاں کا علمی حلقہ بالعموم اردو بولتا اور سمجھتا ہے۔ انہوں نے نہایت اخلاق ومحبت سے میرے ہندو ہونے کے باوجود مجھے اپنے ہاں مہمان ٹھہرایا اور میرے اعزاز میں ایک شاندار پارٹی دی جس کی یہ خصوصیت کبھی نہ بھولوں گا کہ اس میں جس نے بھی تقریر کی وہ میری خاطر سے اردو میں کی۔'' (سید محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیوبند، جلد اول، ص: ۳۶۵)

مولانا اشرف علی تھانوی نے جہاں اپنے رسالہ ''النور'' رمضان ۱۳۴۰ھ میں یہ لکھا کہ ''اردو کی خدمت حسب استطاعت ہر مسلمان پر فرض ہے'' وہیں مولانا عبیداللہ سندھی نے عملی طور پر اردو کے فروغ میں حصہ لیا۔ شاید بہتوں کو علم نہ ہو کہ کابل افغانستان میں پہلی اردو یونیورسٹی مولانا عبیداللہ سندھی کی کوششوں سے قائم ہوئی تھی جس کی پوری تفصیل یونیورسٹی کے پہلے منتظم ظفر حسن بیگ نے اپنی آپ بیتی میں لکھی ہے کہ'' قبلہ مولانا صاحب مرحوم نے صرف قانونی سیاسی کارروائی کرنے کے فیصلے کے سلسلے میں دوسرا کام یہ کیا کہ افغانی گورنمنٹ سے کابل میں ایک ہندوستانی اردو یونیورسٹی بنانے کے لیے چارٹر مانگا اور اس یونیورسٹی کا نظام نامہ تیار کرکے سردار محمود بیگ طرزی، وزیر خارجہ افغانستان کو دیا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ افغانی گورنمنٹ اور امیر صاحب سے اس کی منظوری لے گا۔'' چنانچہ یہ ادارہ قائم ہوا اور اس کا ذریعہ تعلیم اردو زبان قرار پایا۔ آج اس یونیورسٹی کا ذکر صرف تذکروں میں ہے اور اب اردو یونیورسٹی کی جگہ کابل یونیورسٹی قائم ہوگئی ہے۔ جس کا شمار ایشیا کے چند اہم عصری جامعات میں ہوتا ہے۔ اس کی تمام تفصیلات افغانستان کے مشہور محقق اور دانشور پروفیسر عبدالخالق رشید نے اپنے مضمون ''افغانستان میں اردو کی پہلی یونیورسٹی'' میں درج کی ہیں۔

(یہ مضمون سہ ماہی دیوان 'پٹنہ'، مدیر: سید شاہ حسین احمد قبلہ، سجادہ نشین، درگاہ ارزانی 'پٹنہ' شمارہ: ۳،۴ میں شائع ہوا ہے۔)

یہ بات اب سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ اردو کی بقا مدارس سے مشروط ہے۔ پورے ہندوستان میں اگر مدارس نہ ہوتے تو اردو زبان کا دائرہ نہایت سکڑا اور سمٹا ہوا ہوتا۔ یہ اہل مدارس ہی ہیں جنہوں نے اردو زبان کی لفظیات اور لغت میں اضافہ کیا اور اردو زبان کو ان علوم وفنون وموضوعات سے آشنا کیا جو یقیناً اردو کی فکری ثروت میں گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں اور جس سے اردو

زبان کو فکری تحرک اور توانائی حاصل ہوئی۔
تخلیقی سطح پر بھی اپنی فعالیت کا ثبوت دیا اور اردو زبان کے تخلیقی سرمائے میں اضافہ کیا۔

شعری منظر نامہ

دیوبند کے جن اکابر نے عربی مدرسہ قائم کیا اُن میں بیشتر کا ادبی ذوق نہایت بالیدہ تھا اور شعر و سخن سے ان کی گہری وابستگی تھی۔ مولانا ذوالفقار علی دیوبندی، عربی اردو کے ممتاز ادیب و شاعر تھے تو وہیں مولانا فضل الرحمٰن عثمانی اُردو فارسی کے ممتاز شاعر جن کی مشہور تاریخی نظم ''قصہ غم دین'' آج بھی زندہ و تابندہ ہے۔ مولانا محمد یعقوب نانوتوی بھی بلند پایہ شاعر تھے۔ ان کا تخلص گمنام تھا۔ بیاضِ یعقوبی سے اُن کے مختلف لسانی تخلیقی تجربے کی گواہی ملتی ہے۔ انہوں نے غالب، مومن، ذوق، صہبائی اور آزردہ کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ خواجہ میر درد، شیخ ابراہیم ذوق، اور مرزا محمد رفیع سودا، ان کے محبوب شعراء میں سے تھے۔ مولانا قاسم نانوتوی تو خیر شعر و شاعری میں بلند قامت تھے ہی، ان کے علاوہ دیوبند کے اکابر شعر و سخن کا بہت ہی اچھا ذوق رکھتے تھے اور ان لوگوں نے اردو شاعری کو نئے امکانات عطا کئے۔ معنیات، موضوعات اور لفظیات کی سطح پر جتنے اضافے دیوبند نے کیے ہیں شاید کہیں اور ممکن بھی نہیں تھے۔

تخلیقی فکر اور رویئے کے اعتبار سے دیوبند کی شناخت جدیدیت، مابعد جدیدیت یا ترقی پسندیت سے الگ ہے۔ دیوبند کسی دائرے میں قید یا کسی نظریاتی حصار میں اسیر نہیں اور نہ ہی کسی مخصوص ادبی نظریئے، رجحان اور رویئے سے کوئی رشتہ یا واسطہ ہے۔

تغیراتِ عصر اور طرزِ احساس کی تبدیلی کے باوجود دیوبند کا ماضی سے انقطاع کا رشتہ نہیں ہے اور نہ ہی ماضی کے اقدار سے برگشتگی یا انحراف کا اظہار بلکہ ماضی، ماورائیت اور مابعد الطبعیات دیوبند کی تخلیقی حسیت میں حاوی عنصر کے طور پر موجود ہیں۔ ماضی کی بازیافت، کھوئے ہوؤں کی جستجو، روحانی آہنگ کی تلاش، اور بازآفرینی ہی دیوبند کی شناخت ہے۔ دیوبند کی تخلیقی جمالیات میں ماورائی فضا اور مابعد الطبعیات کا عنصر غالب ہے۔

دیوبند کا اپنا ایک الگ ثقافتی اور لسانی نظام ہے۔ یہ عربی فارسی کا ممزوجہ ہے۔ کلاسیکی شعریات سے دیوبند کا رشتہ گہرا ہے، مگر جدید شعریات سے منحرف بھی نہیں ہے۔ دیوبند کی تخلیق کا رنگ و نور بالکل الگ ہے اور ان کے الفاظ کی جدلیاتی منطق بھی جداگانہ ہے۔ دیوبند کے ثقافتی لسانی اور شعری نظام کی تفہیم کے بغیر دیوبند کی تخلیقی حسیت کا ادراک یا اُس کی تعیین قدر ممکن نہیں

ہے۔المیہ یہ ہے کہ دیوبند کے تخلیقی جوہر کی جستجو نہیں کی گئی اور نہ ہی تخلیق کے ممکنہ اطراف کا احاطہ کیا گیا۔اسی لیے معتبر مستند اور مختلف شاعری کے باوجود وہاں کے تخلیق کاروں کو درخوراعتنا نہ سمجھا گیا۔

دیوبند کی پوری شاعری، عوام اساس ہے اور شعری مزاج ترقی پسندوں سے ملتا جلتا کہ دیوبند کی تخلیق میں نوآبادیاتی ذہن، استحصالی قوت جبر و جارحیت کے خلاف ردِّعمل ملتا ہے۔جس طرح ترقی پسند شاعری میں انسانوں کے اجتماعی مفاد اور تہذیب، ثقافت کی اعلیٰ اقدار پر اصرار ہے اسی طرح دیوبند کی شاعری میں بھی اجتماعیت کی تبلیغ ملتی ہے۔دیوبند کی تخلیقی فکر میں ترقی پسندانہ دانش نمایاں ہے اور ان کی تخلیق میں ضبط و تمکین بھی ہے۔انتخاب الفاظ اور تراکیب کے لحاظ سے بھی دیوبند کا تخلیقی کردار زیادہ نمایاں اور فعال ہے۔دیوبند کے تخلیقی اظہار کے امتیازات پر روشنی ڈالی جائے تو اندازہ ہوگا کہ دیوبند میں جو تخلیق کی وجدانی فضا ہے اسے آج کی تخلیق کی وجودی فضا کے مقابلے میں زیادہ بہتر اور مستند قرار دیا جاسکتا ہے۔

تخلیقی منظرنامے پر دیوبند کا نام زیادہ روشن نہ سہی لیکن خدمات کا دائرہ اُن افراد، اشخاص یا اداروں سے زیادہ ہے جنھیں باضابطہ ایک سازش کے تحت نمایاں کرنے کی کوشش عہد قدیم اور عہد جدید دونوں میں جاری رہی ہے۔

دیوبند کے شعری منظرنامے پر مولانا قاسم نانوتوی، شیخ الہند مولانا محمود حسن، ناطق گلاؤٹھی، تاجور نجیب آبادی کے نام نمایاں ہیں کہ اِن افراد نے بہت سی نسلوں کی تخلیقی اور شعری تربیت کا فریضہ انجام دیا ہے۔ان کے علاوہ معاصر شعری سلسلے میں مولانا عامر عثمانی، پروفیسر تنویر احمد علوی، ڈاکٹر مصطفیٰ حسن علوی کاکوروی، انوارالحسن انور شیرکوٹی، فرحت قادری، مولانا عیسیٰ فرتاب، مولانا مناظر احسن گیلانی، یوسف بنوری، مفتی محمد شفیع دیوبندی، نجم الدین ثاقب اور زبیر راہی قاسمی کے نام بھی اہمیت کے حامل ہیں۔

معاصر غزلیہ شاعری میں عتیق انظر، ایم۔آر قاسمی، اعجاز عرفی، طارق بن ثاقب، شمیم عثمانی، غازی ولی کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ان کے علاوہ دیوبند کے فیض یافتہ تخلیق کاروں شاعروں کی ایک طویل فہرست ہے جنھوں نے تخلیق کو نئی جہتیں اور شاعری کو نئے رنگ و آہنگ سے آشنا کیا ہے۔ان میں مفتی جمیل احمد تھانوی، مولانا سید حامد میاں، قاضی عبدالرحمٰن کیملپوری، عبدالرشید نسیم طالوت، قاضی عبدالسلام نوشہروی، حکیم محمد صدیقی قاسمی مرادآبادی، مولانا قاری محمد طیب، سید مہدی حسن شاہ جہاں پوری، مولانا یعقوب نانوتوی، حامدالانصاری غازی، شبیر احمد ازہر میرٹھی، حامد حسین مجاہد قاسمی، مفتی نسیم احمد فریدی، اکبرالدین قاسمی محسن حیدرآبادی، مفتی کفیل الرحمٰن نشاط، کبیرالدین فوزان،

افضال الحق جوہر قاسمی، شاہین جمالی، قسیم الحق گیاوی، زبیر اعظمی، ریاست علی ظفر بجنوری، عبدالجلیل راغبی، اشرف سعودی، محمد غوث غازی ترپاتوری، مولانا نواب طالب، یوسف نسیم قاسمی سرونجی، اختر قاسمی، زبیر فاروقی، سہیل فاروقی، ثاقب گنگوہی، وجدی الحسینی، صادق بستوی، عبدالمبین قاسمی، افتخار الحق ناصر، امام علی دانش، ولی اللہ قاسمی، ڈاکٹر منصور قاسمی، فیضان اشہر بستوی، مولانا عبدالقیوم دانش، منور حسن کمال، وفا اعظمی کے نام بھی شامل ہیں۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی

مولانا کا ادبی ذوق نہایت بالیدہ تھا اور تخلیقی عمل میں ان کے ذہن کی کئی سطحیں متحرک رہتی تھیں۔ ان کے ذہنی تحرکات اور تخلیقی تنوعات کا اندازہ ان کی نعتوں اور مرثیوں سے لگایا جاسکتا ہے۔ وہ فن شعر کے التزامات ہی نہیں بلکہ اسرار سے بھی اچھی طرح آگاہ تھے۔ ان کے شعروں میں جو گداز و تاثیر ہے اور جو کیفیت 'انشراح' ہے وہ قدیم اور کلاسیکی ادبی سرمایہ سے مکمل آگہی کا نتیجہ ہے۔ حضرت حافظ ضامن شہید کی وفات پر جو مرثیہ انہوں نے لکھا ہے، اس میں ان کے سوز دروں، درد دل کے ساتھ ان کے اظہار کا کرب بھی نمایاں ہے، ان کی تخلیقی فکر کی جولانی اور نکتہ رس ذہن کی وسعتوں کا احساس ان اشعار سے ہوتا ہے جس میں ایک شخصی غم کو ہمہ گیر وژن مل گیا ہے اور آفاقیت پیدا ہوگئی ہے:

نہ پوچھ ہو رہے ہیں کیوں خفا ہم جاں سے — ہمیں پالا پڑا ہے اب کے غمہائے دوراں سے
کہیں سے مول لے دل مجھے کچھ اور اے ہمدم — کہ اٹھنے کا نہیں بار غم اس قلب پریشاں سے
چھپا آنکھوں سے وہ نور مجسم خاک میں جاکر — کہ جس کا خال پا بہتر تھا اس مہر درخشاں سے
شہید راہ حق حافظ محمد ضامن چشتی — بنایا تھا جسے حق نے ملا کر عشق و عرفاں سے
فراق یار میں جینا تعجب ہے ولے ہمدم — اجل سے اٹھ سکے شاید نہ ہم بار گناہاں سے
مبارک ہو تمہیں وصل خدا خلد بریں میں، پر — ہمیں یوں چھوڑ کر تنہا تمہیں جانا نہ تھا یاں سے
غم فرقت میں یاں گزرے ہے پر کچھ بن نہیں پڑتی — تمہیں فرصت نہیں واں لذت دیدار یزداں سے
تمہارے ہجر میں جان جہاں کچھ بن نہیں آتا — دل حسرت زدہ گھبرائے ہے سیر گلستاں سے
دل مایوس کی کوئی نہیں صورت تسلی کی — مگر ہاں سر نکالو تم مگر گنج شہیداں سے
تمہاری بزم پر انوار جب یاد آئے ہے ہم کو — تو اک شعلہ سا اٹھتا ہے ہمارے قلب سوزاں سے

لفظیات اور فکریات دونوں اعتبار سے یہ ایک نہایت عمدہ مرثیہ ہے جس میں جذبے کی حدت اور شدت بھی ہے مگر وہ افراط و تفریط نہیں جو مرثیہ کا خاصہ بن چکی ہے۔ یہ حزن کے اظہار کی ایک

ایسی شکل ہے جو نہ اسلامی فکر کے منافی ہے اور نہ ہی جس میں غلو اور مبالغہ ہے۔ یہ حزن وغم کا متوازن ادراک اور اظہار ہے۔ قلب سوزاں سے اٹھتے شعلہ کو شخصی اظہار سے جو رعنائی ملی ہے، وہ اس شعلہ میں شدت پیدا کرنے سے نہیں مل سکتی۔

اس مرثیے میں جس طرح جذبات کی ترسیل کی گئی ہے اس سے احساس ہوتا ہے کہ قاسم نانوتوی ترسیل و ابلاغ میں وضاحت کے قائل تھے۔ اس میں نہ میر انیس، نہ غالب اور نہ اقبال کا آہنگ ہے کہ ان لوگوں کے Icon بننے سے بہت پہلے کی شاعری ہے۔ اس کا رشتہ قدیم ادبیات سے جوڑا جاسکتا ہے مگر اردو شاعری کے اساطین سے انسلاک ممکن ہی نہیں۔ یہ عربی، فارسی روایت کا فیضان ہے۔

مولانا عیسیٰ فرتاب

مولانا عیسیٰ فرتاب، بلند مرتبت معنی یاب شاعر تھے مگر ادبی دنیا، ان کی نوا، سے ناآشنا ہے، قصور کچھ ان کی طبیعت کے استغناء اور بے نیازی کا ہے اور کچھ سکوت سخن شناس اور ناقدری زمانہ کا، ایسا ملٹی لنگول تخلیق کار اور سہ لسانی شاعر جس نے بیک وقت عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں اپنی طبع وقاد اور ذہن رسا کے جوہر دکھائے ہوں اور اپنی شعری لفظیات، تراکیب کی جدت و ندرت مضامین تازہ و معانی نازک سے فصحائے بلاغت شعار پر سکتہ کی کیفیت طاری کردی ہو، ایسے ''جوہر کامل'' اور یگانہ روزگار کا تخلیقی بھیڑ میں کھوجانا، ادبی المیے کے کئی ابواب نگاہوں کے سامنے کھول دیتا ہے۔

اکثر تخلیقی ذہانتوں کے ساتھ ایسے حادثے ہوتے رہے ہیں اور عیسیٰ فرتاب اسی حادثے کی زد میں آگئے، ورنہ اہل نظر کو احساس ہے کہ عیسیٰ فرتاب کی تخلیق میں ذکاوت، نبوغت، ذہانت، بلاغت، رضانت، حمکنت، انفرادیت کے وہ سارے عظیم نشانات ہیں، پھر بھی ادب کی تاریخ میں تذکرہ نہیں کے برابر ہے۔ مولانا فرتاب کے ساتھ جو ناانصافی ہوئی وہ کسی سے مخفی نہیں، ان کے ساتھ جو واردات گزری، اسے دیکھ کر میر تقی میر اور ابن انشا کے شعر بے ساختہ یاد آجاتے ہیں:

رہی نہ گفتہ میرے دل میں داستاں میری
نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری
(میر)

لوگ ہلالی شام سے بڑھ کر پل میں ماہ تمام ہوئے
ہم ہر برج میں گھٹتے گھٹتے صبح تلک گمنام ہوئے
(ابن انشا)

عیسیٰ فرتاب کی خوبی یہ ہے کہ ان کے حواس خمسہ ہمیشہ بیدار رہے اور انہوں نے چشم جہاں بین (compound eye) سے حیات و کائنات کا مشاہدہ کیا۔ کائنات کے اسرار و رموز تک رسائی کی کوشش کی اور اپنی اختراعی، اکتشافی قوتوں سے ایک نئے زاویہ نظر کی تشکیل کی اور بالکل جداگانہ ڈھب کے شعر کہے۔ شاعری میں فکر و فن کے بلند مقامات طے کیے اور کبھی تخلیق کو مضمحل اور احساس کو منجمد نہیں ہونے دیا۔ ان کی تخلیق میں جو رفعت، بلند پروازی ہے وہ کتنوں کو نصیب ہوئی ہے۔

عیسیٰ فرتاب یقیناً ایک تخلیقی جینیس کا نام ہے جس کی تخلیقی فطانت کے گواہ، بوستاں برائے دوستاں (فارسی) اور ارمغان سخن اور رنگ و بو جیسے شعری مجموعے ہیں جنہوں نے نظم، غزل، مثنوی تینوں میں اپنے کمالات کے جوہر دکھائے اور نادر تشبیہات، استعارات اور تلمیحات کے ذریعہ تخلیقی فکر کو نئی جہتوں سے آشنا کیا اور شعری معنیات کے نئے امکانات سے روشناس بھی کیا۔ ان کی تخلیق میں جو تہہ داری اور طرفگی ہے وہ ان کی Radiance energy کا غماز ہے۔ انہوں نے اس 'قوت محرکہ' سے اپنے ذہن کو تابندگی عطا کی ہے، جو نظام شمسی سے جنم لیتی ہے۔

عیسیٰ فرتاب کی قوت مشاہدہ اور عرفانی بصیرت نے ان کی تخلیق کے رنگ کو دوسروں سے متمائز کر دیا ہے۔ ان کا تخلیقی زاویہ بھی مختلف ہے اور ان کی سوچ کی کرہ بھی الگ ہے۔ وہ ایک ایسے اجنبی منطقے کے باسی نظر آتے ہیں، جہاں دور دور تک کسی مانوس رویے اور نظر کا نشان نظر نہیں آتا۔ فرتاب کے دو شعر ہیں جن میں کتنی بڑی مابعد الطبعیاتی حقیقت کا اظہار ہے۔ ان شعروں کی سریت اسی پر منکشف ہو سکتی ہے جو کشف کے مدارج و مقامات سے آگاہ ہو۔ یہ سراسر تصوف کے شعر ہیں اور ان میں وہی تصوف کے اسرار و نکات ہیں جن کی ظاہری تفہیم گمراہ کر سکتی ہے:

بے زبانی سے ہوں عاجز ورنہ راز ہست و بود
عام لفظوں میں بیاں کرنا بھی کیا دشوار تھا

تجھ کو ہے معلوم اے فرتاب راز زندگی
عقل کے نزدیک راز بے زبانی کچھ نہیں

یہ ماورائی انا (Transcdental self) کی بیداری کی کیفیت کا اظہار ہے۔ یہ سکوتِ تحیر

ہے۔ یہ مراقباتی اور وجدانی کیفیت (Ecstasy & Rapture) کو ظاہر کرتا ہے۔ اس Sound of Silence کو ہر کس و ناکس نہیں سمجھ سکتا۔ اس بے زبانی اور خوشی میں جو رمز ہے، اس رمز سے اربابِ طریقت اور اہل دل ہی آگاہ ہیں۔

علامہ اقبال نے ایک شعر میں اسی احساس کو بیان کیا ہے:

گفتار کے اسلوب پر قابو نہیں رہتا
جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

فرتاب کے ہاں تکوینِ اسالیب بھی ہے اور توسع بھی، ان کا حریمِ تخیل محدود نہیں، بے کراں ہے، انہی کے شعر ہیں جن میں شکوہ بھی ہے، شکستگی کا احساس بھی:

میری نظیر نہ ہوتا کوئی زمانے میں
نگاہ لطف سے گر دیکھتا خدا مجھ کو
محبت کا لہو پوشیدہ ہے مرے رگ و پے میں
دکھاؤں کیا تجھے نظارہ اپنے داغِ پنہاں کا

ممتاز ناقد پروفیسر علیم اللہ حالی نے فرتاب اور اقبال کے ذہنی، فکری اشتراکات اور موضوعی مشابہات و مماثلات کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

''فرتاب کے کلام کا عام رنگ جوش اور اقبال کی شاعری سے ملتا جلتا ہے، وہی انداز بیاں، وہی گھن گرج، وہی فکر و فلسفہ، وہی قومی درد جو اقبال کی شاعری کا طرہ امتیاز ہے اور جوش کے ہاں بھی گاہے گاہے مل جاتا ہے۔ فرتاب کے پورے مجموعہ کلام پر اثر انداز ہے۔ بہت سی نظمیں تو ایسی ہیں کہ عنوانات اور موضوعات کے اعتبار سے بھی اقبال کی نظموں سے مماثلت رکھتی ہیں۔'' (احتساب)

حالی صاحب کا یہ مطالعہ یک رخی ہے۔ مابعد جدید نظریے سے دیکھا جائے تو ماقبل متن کی یہ تشکیل جدید ہے اور ہر متن ماقبل میں موجود ہے۔ یہ اقبال کے متن کی تخلیقی بازیافت ہے اور اس سے فرتاب کی عظمت یا انفرادیت مجروح نہیں ہوتی کہ قدیم متن پر نئے متن کی تشکیل کا عمل مابعد جدید نظریے سے نہ صرف روا ہے بلکہ بیشتر متن کے ساتھ معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔

عیسیٰ فرتاب کا تعلق ارریا کی سرزمین سے ہے، خدا کا شکر ہے کہ وہاں کی سرزمین میں اب ان کی قدر شناسی کے سلسلے کا آغاز ہوا ہے۔ ڈاکٹر فرحت آرا (ارریا) نے ان کی شاعری کے حوالے سے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا ہے، اسی طرح جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی کے شعبہ فارسی میں افروز

عالم نے ان کی فارسی خدمات کے تعلق سے ایم۔فل کی تھیسس لکھی ہے۔

مولانا مفتی نسیم احمد فریدی

مفتی نسیم احمد فریدی اردو کے ممتاز شاعر تھے۔ حدیث کی تدریس کے ساتھ شعر و سخن کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ شاعری میں منشی عزیز احمد امروہوی اور منشی عبدالرب شکیب صدیقی سے مشورۂ سخن کیا۔ ان کا ایک دیوان 'نسیم سحر' کے عنوان سے انیس احمد فاروقی نے مرتب کیا ہے۔ انہوں نے نعت، منقبت اور غزل میں اپنی قادرالکلامی کا پورا ثبوت دیا اور امروہہ میں استاد شاعر کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کی۔ ان کی غزل سے ان کی تخلیقی جودت، ندرت اور فنی قدرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

وہ ان کا چشم سخن گو سے گفتگو کرنا
وہ اپنا کوشش اظہار آرزو کرنا

کسی کا ناز تلون پسند اے ہمدم
سکھائے گا ہمیں تعمیر آرزو کرنا

اسی میں ہے کہیں تریاق فرط بے تابی
نگاہِ یار کے گوشوں میں جستجو کرنا

بتائے گی تجھے اسرارِ بے خودی ناصح
کبھی نگاہِ سخن گو سے گفتگو کرنا

میں سیر چشمی ساقی سے خوب واقف ہوں
پسند ہے اسے میرا سبو سبو کرنا

فریدیؔ ہم وطنِ مصحفی کو کب ہے روا
زبان کو قیدیٔ دہلی و لکھنؤ کرنا

یہ کلاسیکی رنگ میں کہی ہوئی غزل ہے جس میں فکری وضاحت اور اظہاری لطافت کے ساتھ غزلیہ ایمائیت اور تہہ داری بھی ہے۔ اس غزل کی لفظیات پر غور کیا جائے تو ساقی، سبو، نگاہ یار کے الفاظ فریدی کے لسانی شعور اور تخلیقی فکر کو واضح کرتے ہیں۔

زبیر احمد راہی قاسمی

زبیر احمد راہی قاسمی سرونج کے استاد شاعر ہیں جو اپنے منفرد رنگ اور آہنگ کی وجہ سے ادبی حلقے میں اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں۔لطف ادا اور بندش کے اعتبار سے بھی ممتاز ہیں۔ پروفیسر خالد محمود نے ان کے شخصی اور فکری، فنی خصائص و امتیازات کے حوالے سے لکھا ہے:

''راہی قاسمی کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے دینی علوم کے ساتھ مشرقی شعریات خصوصاً عربی اور فارسی کا راست مطالعہ کیا ہے۔ دیوبند سے فارغ ہوکر عصری تعلیم حاصل کی اور ایک استاد کی حیثیت سے ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ راہی قاسمی فن شعر پر عبور رکھتے ہیں۔ان کی یہ خوبی اور علمی مرتبہ انہیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز کرتا ہے۔ راہی قاسمی اردو کے علاوہ فارسی زبان میں بھی شعر کہتے ہیں۔خصوصاً ان کی فارسی نعتیں عقیدت اور فن کے اعتبار سے مایہ ناز ہیں۔ان کی شاعری میں عشق مجاز اور تصوف کی رنگ آمیزی کے علاوہ سیاست کی بے راہ روی پر بھی لاتعداد اشعار موجود ہیں۔ ایسے اشعار میں وہ طنز کا سیدھا وار کرتے ہیں۔ زمانے کی کج ادائی، عزیزوں اور دوستوں کی بے اعتنائی اور معشوقانِ ستم پیشہ کی بے وفائی پر انہوں نے ہزار زاویے سے روشنی ڈالی ہے۔ ابتدا میں انہوں نے بہت سی نظمیں کہی تھیں۔ان کی اکثر عشقیہ نظمیں اختر شیرانی کے رومانی عہد کی یاد تازہ کرتی ہیں۔غزل میں سوز و گداز اور حزن و ملال کی کیفیت ہے لیکن جہاں کہیں طنز کا استعمال کیا ہے کھل کر وار کرنے کو ترجیح دی ہے۔ سیاسی اشعار میں یہ رویہ نکیلا اور دھاردار ہو جاتا ہے۔''

(سرونج کی کلاسیکی شاعری کے عناصر اربعہ، مشمولہ: ادب کی تعبیر)

راہی قاسمی کی شاعری سے ان کے سوز دروں اور آتش نہفتہ کا سراغ لگایا جاسکتا ہے:

اس شعلہ پنہاں کو لے جائیں گے محشر تک
ہم ہوں گے قیامت میں اور درد جگر ہوگا

آرہی ہے ذرے ذرے سے صدائے الفراق
اشک خونیں دیدہ تر سے رواں ہونے کو ہے

ہم ان کی بزم سے اٹھ کر تو آگئے لیکن
سوال یہ ہے کہ اب زندگی کہاں گزرے

میں نے ایسے بھی کئی نقش قدم چھوڑے ہیں
دیں گے راہی کو جو منزل کا پتہ میرے بعد

پروفیسر خالد محمود نے ان کی شعری لفظیات اور نظام افکار کو دیکھتے ہوئے بالکل منصفانہ اور برحق رائے دی ہے کہ ''ان کے کلام میں جابجا اقبال کے اثرات اور ترقی پسند تحریک کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔''

مولانا یوسف نسیم قاسمی سرونجی

مولانا یوسف نسیم قاسمی سرونجی بھی عربی، فارسی کے متبحر عالم ہونے کے علاوہ اردو کے عمدہ شاعر ہیں، جن کی بلند ادبی قامت کی وافر شہادتیں ہیں۔ کلاسیکی رنگ میں شعر کہتے ہیں اور سلاست، فصاحت اور وضاحت کے ساتھ ان کے ہاں اناقت بھی ہے۔ ان کے اشعار سے ان کے فکر و اسلوب کی پختگی اور شگفتگی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

جو لمحے حاصل عمر رواں تھے
وہی اے کاش آجائیں کہیں سے

جسے دارالاماں کہتی ہے دنیا
اٹھے گا فتنۂ محشر وہیں سے

جب آہ نکلتی ہے لب زخم جگر سے
خالی نہیں رہتی ہے کبھی اپنے اثر سے

ڈاکٹر شان فخری کی اطلاع کے مطابق مولانا نے بہت سے تاریخی دستاویزات کا ترجمہ بھی کیا ہے اور مشہور تاریخ داں پروفیسر اختر حسین نظامی کی شراکت میں یہ کام انجام دے رہے ہیں۔

احمد سعید خاں اختر قاسمی

احمد سعید خاں اختر قاسمی کم گو ہیں مگر خیال میں جو صفائی اور اظہار میں بلا کی سلاست و سادگی ہے وہ قاری کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتی۔ ان کے چند شعر، شان فخری نے اپنی کتاب ''سرونج کی ادبی خدمات'' میں درج کیے ہیں جن سے ان کے تخلیقی اور لسانی نظام سے آگہی ہوتی ہے:

ہر نظر محروم نظارہ ہو ایسا بھی نہیں ہے
چشم بینا ہو تو حائل کوئی پردا بھی نہیں

صلہ تو جذب محبت کا پاچکے منصور
انہی کے ساتھ جہاں سے مقام دار گیا

حاصل زیست ہیں یہ ان کا مداوا کیسا
داغ تم دل کے مٹاتے ہو یہ کیا کرتے ہو

یہ تیرا فیض کرم ہے کہ چرخ عزت پر
سعید خستہ کو اختر بنا دیا تونے

مولانا نواب طالب

مولانا نواب طالب، دیوبند کے فیض یافتہ تھے۔ ان کا تعلق چھتیس گڑھ کی ریاست سے ہے۔ نہایت خوددار، صوفی منش، استاد شاعر تھے۔ ۸رجون ۲۰۰۳ء کو ۷۰ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے یہ دوشعران کی فکری اورفنی شناخت کا حوالہ ہیں:

فصل گل ہے تو ذرا بوئے ثمر بھی لائے
یوں صبا آئے کہ پیارے کی خبر بھی لائے

بلند کرگیا وہ دار پر چڑھا کے مجھے
زمانہ دیکھے گا اب سر اٹھا اٹھا کے مجھے

ان کی وفات پرخراج عقیدت پیش کرنے کے لیے چھتیس گڑھ اردو ہندی سنگم نے ایک طرحی مشاعرہ منعقد کیا۔ گوہر جمالی (رائے پور) کی رپورٹ موشوعہ (فنکار، گوالیار، جنوری ۲۰۰۴ء) کے مطابق چھتیس گڑھ کے معروف شاعروں نے ان کے طرحی مصرعے "زمانہ دیکھے گا اب سر اٹھا اٹھا کے مجھے" پر اشعار کہے اوراس طرح انہیں خراج عقیدت پیش کیا۔

غازی ولی

غازی ولی، نجیب الطرفین ہیں۔ ممتازعلمی خانوادہ سے تعلق ہے۔ ان کے جدامجد نواب

عبدالصمد خاں عرف سمند خاں معروف شخصیت تھے۔ شعر و ادب کا صاف ستھرا مذاق ہے۔ سرونج کی ادبی روایت کے امین، نثر و نظم دونوں میں کامل دست گاہ، شعر و سخن کے سلسلہ سے راہی قاسمی، مخمور سعیدی سے اکتساب فیض کرتے رہے ہیں۔ حمد، نعت، سلام، منقبت کے علاوہ غزل میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی غزلیں روایت اور جدت کا حسین امتزاج ہیں۔ ان کے پرواز تخیل اور طرز سخن کی شہادت کے لئے یہ چند شعر کافی ہیں:

ایسا نہ ہو بھڑک اٹھے اے آہ مضطرب
مدت سے ہے جو آگ سی دل میں دبی ہوئی

یا رب بہار آتے ہی آخر یہ کیا ہوا
بدلا ہوا ہے رنگ گلستاں مرے لئے

نظر آئے گا ہر سو پھر وہی وجد آفریں عالم
کچھ ایسے وجد کے عالم میں اس محفل سے ہم نکلے

اشرف سعودی

اشرف سعودی کا جنم آرکاٹ تمل ناڈو میں ۱۹۴۰ء میں ہوا۔ وہ اردو شعر و ادب کا نہایت شستہ اور شائستہ ذوق رکھتے ہیں۔ نظموں اور غزلوں سے تخلیقی رشتہ ہے۔ علیم صبا نویدی نے ان کے بارے میں لکھا ہے: ''ادب کو اعلیٰ ترین انسانی قدروں کا پاسبان بنانے کے باوجود اسے پروپیگنڈہ نہیں بننے دیا۔ آپ کی تخلیقات فن اور قدر دونوں کے حسین امتزاج کا نمونہ ہے۔'' علیم صبا نویدی ہی نے اپنی کتاب ''تمل ناڈو میں اردو'' میں ان کے کچھ شعری نمونے شامل کیے ہیں۔ یہ اشعار نہایت حکیمانہ اور مقصدیت سے بھرپور ہیں۔ سہل ممتنع میں کہے گئے ان اشعار میں جن خیالات اور احساسات کی عکاسی ہے، ان سے اشرف سعودی کے قلب و نظر کی پاکیزگی کا پتہ چلتا ہے:

ریت سمجھو رواج پہچانو
زندگی کا مزاج پہچانو

کج کلاہی کرے ہماری کیا
سر پہ کس کے ہے تاج پہچانو

کب تک آخر مطالعہ ہوگا
نگہہ احتیاج پہچانو

پہلے تشخیص تو مرض کی ہو
پھر طریقۂ علاج پہچانو

کیا قیامت کی چال ہے اشرفؔ
کل نہیں اس کو آج پہچانو

شمیم عثمانی

بیان کا حسن اور تخیل کا جمال شمیم عثمانی کی شاعری میں درجہ کمال تک پہنچ گیا ہے۔ سادہ، سہل طرزِ اظہار میں فکری اعماق و امعان ان کا تخلیقی امتیاز ہے۔ تاریخ، تلمیح اور تہذیب سے تشکیل شدہ ان شعری عبارتوں میں کتنے زبانوں اور واقعات کا اندراج ہے۔ شعری کرداروں کی تاریخی تقلیب سے تفہیم کے نئے زاویے روشن ہوتے ہیں۔ ان عبارتوں کی تہہ میں تاریخ، تہذیب اور ماضی کا درد بھی ہے اور عصرِ حاضر کا کرب بھی:

تیشوں کو نیند آگئی کہسار سوگئے
تاریخ جاگتی رہی کردار سوگئے

وہ رات تھی کہ جاگتے رہنا تھا ایک جرم
جو لوگ تھے ذرا سے بھی ہشیار سوگئے

بے چارگی تو دیکھئے ہم یوسفانِ فن
جاں بیچنے پہ آئے تو بازار سوگئے

یہ تو کہانیوں کا زمانہ ہے دوستو
جو سرفروش تھے وہ سردار سو گئے

ان اشعار نے عہد کے کتنے جاں گسل، دلدوز واقعات رقم کردیئے ہیں اور ہماری رات کا رشتہ میر کی اس رات سے جوڑ دیا ہے جو رات شاید آج ہر شہر اور ہر فرد کی تقدیر بن کر رہ گئی ہے۔ شمیم عثمانی کی شاعری میں وہ نگہ سحرفن ہے جو قاری کو اسیر کر لیتی ہے۔

شمیم عثمانی کا تعلق دیوبند کے ممتاز علمی خانوادے سے رہا ہے۔ وہ گوکہ انگریزی کے استاد تھے مگر عربی، فارسی، اردو اور ہندی پر بھی قدرت کاملہ تھی۔ دارالعلوم دیوبند کے فیض تربیت نے ان کے دل و دماغ کو جو روشنی اور رعنائی عطا کی، وہی روشنی ان کی شاعری میں بھی ہے اور ہر شعر ان کی صحت مند فکر و زبان کا آئینہ دار ہے۔ وہ اہمال، ابہام نہیں ہے، ان کی شاعری میں، جو کبھی جدیدیوں کا شیوہ تھا جسے آج کے بھی بعض شعراء، بطور فیشن اپنائے ہوئے ہیں۔ ان کی شاعری میں جو ترسیلی قوت ہے، وہ فیض ہے، سادگی اظہار و بیان کا اور وضاحت فکر کا ــــ شمیم عثمانی کا مجموعہ کلام منظر عام پہ آجاتا تو شاید ان کے تعین قدر میں ناقدوں کو آسانی ہوتی اور ان کے ساتھ انصاف ہوتا مگر حیف ان کی بے نیازی سے اردو آبادی اچھی شاعری کی مجموعی قرأت سے محروم رہ گئی۔ منظور عثمانی کی اس بات سے مجھے صد فی صد اتفاق ہے کہ:

''جس دن شمیم کا مطبوعہ کلام اہل نظر کی نظروں سے گزرے گا اس دن اردو ادب کی دنیا کو احساس ہوگا کہ شمیم کتنا بڑا فن کار تھا''

(شمیم عثمانی: اپنی ذات سے ایک انجمن، پیش رفت دہلی، جون ۲۰۰۵ء)

شاہین جمالی

شاہین جمالی کلاسیکی رنگ میں شعر کہتے ہیں۔ ان کی شاعری پڑھ کر جگر مرادابادی اور اصغر گونڈوی کے اسالیب اور افکار کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ لطافت اظہار کی مظہر یہ غزل دیکھئے:

آنکھوں میں جو اشکوں کا یہ طوفاں ہے ابھی سے
وہ ترک تعلق پہ پشیماں ہے ابھی سے!

دیوانے ابھی موسم گل تو نہیں آیا
وحشت میں ترا چاک گریباں ہے ابھی سے

میخانہ سے اک پیر مغاں ہی تو اٹھا ہے
افسردہ سی کیوں محفل زنداں ہے ابھی سے

کانٹوں کی زباں بند لب گل پہ زہر خند!
کیسا یہ رخ فصل بہاراں ہے ابھی سے

شیشے میں ترے توبہ سے گھول رہا ہوں!
کس سوچ میں تو واعظ ناداں ہے ابھی سے

معلوم نہیں جوشِ محبت میں کرے کیا
ہاتھوں میں کسی کے ترا داماں ہے ابھی سے

میں اپنی وفاؤں کا صلہ مانگ رہاہوں!
تو اپنی جفاؤں پہ پشیماں ہے ابھی سے

زنجیر کے حلقے بھی صدا دینے لگے ہیں
دیوانہ ترا قابل زنداں ہے ابھی سے

میں اپنی تباہی کا سناتا ہوں فسانہ!
کیوں آپ کی پلکوں پہ چراغاں ہے ابھی سے

شاہینؔ انہیں کہہ دو کہ لب بام نہ آئیں
لرزاں دل زاہد میں تو ایماں ہے ابھی سے

شاہین جمالی کے اس تخلیقی آہنگ میں رومانیت اور روحانیت کا حسن امتزاج ہے۔ غزل کا کوئی بھی شعر ایسا نہیں ہے جس میں قوت تاثیر نہ ہو۔ ان کی لفظیات سے اندازہ ہوتا ہے کہ غزل کی روایت پر ان کی نظر کتنی گہری ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس غزل میں وہی غنائیت اور تغزل کی کیفیت ہے جو جگر سے مخصوص ہے!

عتیق انظر

عتیق انظر اپنے مختلف تیور کی وجہ سے معاصر شعری منظرنامہ میں ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ ان کی تخلیق میں تازگی، اچھوتا پن، ندرت ہے اور ان کا جوطرز اظہار ہے؛اس میں کلاسیکی رنگ کے ساتھ جدت کا بھی امتزاج ہے۔ انہیں زبان و بیان پر عبور ہے اور فقہ اللسان سے بھی باخبر ہیں۔ اس لیے لسانی ندرتوں کے اعتبار سے بھی ان کی غزلیہ شاعری مختلف ہے۔ جہاں تک فکر کی بات ہے تو ان کی فکر میں قدیم و جدید دونوں دنیائیں ہیں اور دونوں کے بحران سے بھی وہ آشنا ہیں۔ جدید انسان کا بحران، وجودیاتی کشمکش اور انسانی اضطراب و التہاب کو انہوں نے اپنے تخلیقی قالب میں

ڈھالا ہے اور آج کے انسان کے مسائل و مشکلات، دکھ، درد کی لہروں کو مس کیا ہے۔ عتیق انظر کا شعری مجموعہ ''پہچان'' کے عنوان سے ادبی حلقہ میں اعتبار حاصل کر چکا ہے۔ راشد آذر نے ان کے اظہاری اختصاص کا اعتراف یوں کیا ہے:

''بڑی خوشی کی بات ہے کہ عتیق انظر اپنے لہجے کی شناخت بنانے کی طرف توجہ دے رہے ہیں۔ ان کو ان کے انداز بیان کی تازگی اور اچھوتے پن سے پہچانا جاسکتا ہے۔ آگے چل کر یہ وصف ان کے انفرادی لہجے کی تشکیل میں معاون ثابت ہوگا۔''

(ماہنامہ سب رس حیدر آباد، جنوری ۱۹۹۶ء)

عتیق انظر کے تخلیقی جلال و جزالت کا جلوہ اس غزل میں موجود ہے:

سب کو نفرت میں تری جوڑ دیا ہے میں نے
تجھ کو دنیا میں الگ چھوڑ دیا ہے میں نے
جس کی ہیبت سے سبھی سہمے ہوئے رہتے ہیں
ایک تیر اس کی طرف چھوڑ دیا ہے میں نے
میں رہوں یا نہ رہوں تیرے مقابل آکر
تیری طاقت کا بھرم توڑ دیا ہے میں نے
ڈال کر ہاتھ گریباں پہ اک ظالم کے
آج تاریخ کو ایک موڑ دیا ہے میں نے
میری تلوار کی زد میں مرا دشمن تھا مگر
یاد کچھ کر کے اسے چھوڑ دیا ہے میں

اس غزل میں عصری شعور کی گونج ہے اور شکستگی کے باوجود جو self-esteem جرأت مندی اور پامردی کا جذبہ ہے، وہ قابل ستائش ہے۔ خلیجی جنگ کے پس منظر میں اس غزل کی تفہیم کئی زاویوں کو روشن کرسکتی ہے۔ اس میں جو اشارات، ہیں ان اشاروں کا سمجھنا آسان ہے۔ غزل کا لہجہ اور اس کا آہنگ بھی اس کیفیت سے ہم آہنگ ہے جس سے مسلم دنیا دوچار ہے۔ تخلیقی جرأت اور حوصلہ مندی کی یہ ایک نمایاں مثال ہے۔ غزل کے ہر ایک شعر میں ایک رجزیہ کیفیت، عنتری، مرجبی لہجہ ہے اور اس تخلیقی پیرہن سے بوئے اسد اللہی بھی آرہی ہے۔ ستم کی سیاہ رات میں سروں کے جلتے چراغ کا منظر اس غزل میں منور ہے۔ یہ ہم عصری صداقت کا جرأت مندانہ اظہار ہے۔

سیاسی، عصری رمزیت سے بھرپور اس غزل کا سیاق و سباق ہر باشعور قاری پر فوراً واضح ہوجاتا

ہے۔ غزل کا ڈکشن اور اس کا Ethos فیض احمد فیض، مجروح اور ناظم حکمت کے لہجے کی یاد تازہ کرتا ہے۔

ایم آر قاسمی

غزل کے عصری منظرنامہ پر ایک نام بہت روشن اور نمایاں ہے، جو اپنے مختلف تخلیقی تیور اور شعری آہنگ سے اپنی شناخت مستحکم کر چکا ہے جو زندگی کے تضادات میں امتزاج تلاش کرتا ہے اور داخل و خارج کے ارتباط سے عصری و باطنی واردات رقم کرتا ہے، جس کی ایک آنکھ میں ماضی کا منظرنامہ ہے تو دوسری آنکھ میں حال کے حقائق ہیں۔ ماضی اور حال کی لہروں کے ساتھ مستقبل کی طرف بڑھنے والے اس شاعر کا نام ایم آر قاسمی ہے۔

ایم آر قاسمی کی غزل میں عصری شعور کی گونج ہے اور حال کا وہ ادراک جو آج کے تخلیق کاروں کو اضطراب سے گزارتا ہے۔ قاسمی نے آشوب عصر اور عذاب عصر حاضر کو اپنی تخلیقی بصیرت سے محسوس کیا ہے اور اس آشوب کو اظہار کی وہ زبان عطا کی ہے کہ قاری اس آشوب کا اسیر ہو جاتا ہے اور ایک خارجی کرب اس کے داخلی درد میں موجزن ہو جاتا ہے۔ یہ تخلیق کی تاثر آفرینی ہے کہ باہر کی کیفیت باطن میں ہلچل مچا دے اور ایک ایسے طوفان کو جنم دے کہ باطن اور خارج کی دوئی مٹ جائے۔

قاسمی نے اپنی شاعری میں حیات و کائنات کے تضادات اور تناؤ کو بہت ہی فن کارانہ ہنرمندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے شعروں میں ماضی کا فسانہ بھی ہے اور آج کی بات بھی اور آج کی وہ رات بھی جس کا سلسلہ صدیوں سے جڑا ہوا ہے۔ ان کے تخلیقی احساس و اظہار کے رنگوں کی شناخت ان شعروں سے ہو سکتی ہے جن میں استعجادی تکنیک میں زندگی کی حقیقتوں کا انکشاف ہے۔ Paradoxical realities کو اظہار کی جو شکل عطا کی ہے وہ شکل، معاصر غزلیہ شاعری میں کہنہ مشق اور تجربہ کار تخلیق کاروں کا ہی حصہ ہے:

ریگ مقتل پہ لاشوں کا انبار
میرے چاروں طرف کوئی اسرار سا

سوچتا ہوں زمانے کے اسرار کو
میں کہ حیرت زدہ نقشِ دیوار سا

یہ کیا کہ ایک ہی موسم کا مرثیہ لکھوں؟
نئے دنوں کا بھی تھوڑا سا نغمہ خواں ہو جاؤں

بجھا چکی ہے ہوا جس کو، وہ دیا بھی میں
مگر یہ دیکھ! بہت دیر تک جلا بھی میں

مرے نصیب میں پت جھڑ کے راستوں کے سفر
سدا بہار دیاروں سے آشنا بھی میں

مری طرف تھیں کبھی بارشیں بھی پھولوں کی!
حصارِ سنگ و صدا میں گھرا ہوا بھی میں

وصال لمحوں سے جی بھر گیا تو گریہ کناں!
لبوں پہ رکھے ہوئے ہجر کی دعا ہم تھے

ترے دیار کی مٹی ہوئی ہمیں زنجیر!
وگرنہ یار! کہاں اتنے دیرپا ہم تھے

یاد کا رنگ پُراسرار بہت ہے اب کے
یعنی پھر گرمیِ بازار بہت ہے اب کے

آندھیاں بھی تو کہیں جشن مناتی ہوں گی؟
کیا ہوا پیڑ جو چھتنار بہت ہے اب کے

ہر افق ڈوب چکا شام کی تاریکی میں
شہر سورج کا، عزادار بہت ہے اب کے

جس سے اِس آفتاب کی ضو شرمسار ہو!
ایسا بھی کوئی داغِ جگر ہم کو بھیج دے

تاکہ ہم اطمینان سے سوئیں تمام عمر!
تو اپنے جاگنے کی خبر ہم کو بھیج دے

ہم مثلِ گرد باد رواں ہیں یہاں وہاں
مرضی پہ ہے ہوا کی! جدھر ہم کو بھیج دے

ایم آر قاسمی کے ہاں عصری غزل کا اسلوب و آہنگ نمایاں ہے اور انہوں نے نا تراشیدہ الفاظ اور تراکیب سے حذر کیا ہے اور زبان و بیان کی صفائی اور فکری صحت کا بھی خیال رکھا ہے۔ اس میں جدیدیت کی افسردگی، یاس و تنہائی نہیں ہے بلکہ ایک نشاطی کیفیت ہے مگر اس کا رشتہ مابعد جدیدیت سے بھی نہیں ہے بلکہ یہ تمام نظریاتی رویوں اور تحریکوں سے الگ اپنی ذات کے عرفان اور کائنات کے انکشاف کی شاعری ہے۔ شاعر کا اپنا زاویۂ نظر ہی اتنا مربوط و مستحکم ہے کہ اسے کسی اور نظریاتی پناہ گاہ کی ضرورت نہیں!

اعجاز عرفی

اعجاز عرفی خوش گفتار اور موزوں طبع شاعر ہیں۔ انہیں جدید اور قدیم شعریات سے مکمل آگہی ہے۔ ان کی شاعری میں عصری کرب، نشتریت، انقلاب، رومانیت اور تخلیقیت کی گہری فضا ہے۔ عصری حسیت، نئی بصارت، فکر و آہنگ اور اظہار سے معمور ان کی یہ غزل ان کی تخلیقی ندرت کی گواہ اور ان کے خارجی اور داخلی تجربے کا بہترین بیانیہ ہے۔ اس میں سیاسی، سماجی حسیت کی شناخت بآسانی کی جاسکتی ہے۔ اعجاز عرفی کی شاعری کا سروکار ہمارے سماج اور سیاست سے بھی ہے اور اس سے بھی جس میں یہ فن کار درد کے پیوند لگاتا جا رہا ہے:

کس جگر سے ہم تباہی کا سماں دیکھا کئے — آشیاں جلتا رہا اور باغباں دیکھا کئے
منظر انجام سعی رائیگاں دیکھا کئے — حسرتوں کے ساتھ سوئے آسماں دیکھا کئے
ہم وہ مظلوم قفس ہیں جو بہار آنے کے بعد — اپنے جلتے آشیانے کا دھواں دیکھا کئے
کفر ہے اس خواب کی تعبیر یا ایماں نواز — ہم حرم میں بیٹھ کر روئے بتاں دیکھا کئے
گردشِ ایام تیرے ظلم کے سایہ میں ہم — زندگانی کے ہزاروں کارواں دیکھا کئے
اس قدر ٹوٹے ستم سب پر کہ ہم بھی دیر تک — بے زبانوں کا تماشائے فغاں دیکھا کئے
تیری نظروں کا کرشمہ تھا کہ اپنی سادگی — رات بھر ہم جانب پیر مغاں دیکھا کئے
حال کچھ کہہ نہ پائے دیکھ کر رعب و جلال — زخم دل دیکھا کئے تاب زیاں دیکھا کئے
ان کی یادوں میں گزاری یوں بھی راتیں بارہا — گاہے دامن گاہے چشم خونچکاں دیکھا کئے
گلشن عالم کی اس بگڑی روش کا کیا علاج — دوستوں کو ہمزاج دشمناں دیکھا کئے

جادۂ حسن ازل کے فیض سے عرفیؔ مدام
ہر نظر میں مکاں وا لامکاں دیکھا کئے

اعجاز عرفی کے اس شبنمی اظہار میں کتنی شعلگی ہے، اس کا احساس ان کی لفظیات سے لگایا جاسکتا ہے۔ کتنی سادگی سے ان ساری کیفیات اور درد کا اندراج کیا گیا ہے جن سے پوری قوم گزر رہی ہے۔ اِس میں طنز بھی ہے اور وہ تیر ونشتر بھی جو قاری کے احساس کو چھلنی چھلنی کرسکتا ہے۔ یہ مہذب احتجاج بھی ہے اور تخلیقی ردِعمل بھی۔ اپنے شعلہ آگیں احساس کو شبنمی پیراہن عطا کر کے تخلیق کار نے بڑی خوبصورتی سے وہ ساری باتیں کہہ دی ہیں جس کے لیے دوسرے شاعروں کو بلند آہنگ، خطیبانہ یا رجزیہ انداز اختیار کرنا پڑتا۔ اعجاز عرفی کی یہ غزل رومانی انقلابیت یا انقلابی رومانویت کی ایک اچھی مثال ہے۔ اِس غزل میں فیض احمد فیض کے مدھم آہنگ اور انقلابی احساس کی پرچھائیاں نظر آرہی ہیں۔

طارق بن ثاقب

طارق نئی سوچ کے نئے شاعر ہیں۔ نہ روایت سے بغاوت کی نہ انحراف اور نہ اس کے حصار میں خود کو قید کیا۔ خصوصاً اس روایت سے گہرے طور پر وابستہ ہیں جس میں انہوں نے عمر عزیز کا ایک حصہ صرف کیا ہے اور جس کی وجہ سے انقلاب کی لہر بھی ان کی شاعری میں در آئی۔ انہوں نے اپنی آنکھیں کبھی بند نہیں رکھیں۔

نئے دور کا انسان جن پر آشوب حالات و کیفیات، روحانی و ذہنی خوف، غصہ، اداسی، بے یقینی اور احساس شکستگی سے دوچار ہے۔ شاعر نے بھی اسے محسوس کیا ہے اور دور حاضر کے درد و کرب، المیے سانحے اور حادثات کا بھی اسے ادراک ہے۔ آشوب دہر، غم کائنات اور احترام آدمیت کے جذبات سے مملو ہے طارق کی شاعری۔ انہوں نے انسانی اقدار کے زوال کا نوحہ لکھا ہے اور انسان کے انحطاطی سفر کی کہانی یوں تحریر کی ہے:

درندے جن کے تقدس پہ جاں نثار ہوئے
انہی میں آگئی اب تو درندگی ساقی
جو پاسبان تھے مہر و وفا کے دنیا میں
ان ہی میں مہر و وفا کی ہے اب کمی ساقی
کمین ظرف کو حاصل ہے یوں متاعِ حیات
کہ گویا مل گئی ان کو شہنشہی ساقی

طارق امید و یقین کے شاعر ہیں، اس لیے یہ جانتے ہوئے کہ لوگوں نے اتنے بت تراش

لیے کہ کائنات انسانوں کے لیے محدود اور تنگ ہوگئی ہے، وہ عزم واستحکام کے ساتھ یوں کہتے ہیں:

بس اس کے بعد ہی پھر جرأت خلیلی ہے
رہے گی تا کجے؟ یہ رسم آذری ساقی

طارق کی شاعری میں فکر فردا اور پیغام بیداری ہے۔ اس لیے وہ نوجوانوں کے عزم وحوصلے کو للکارتے ہیں کہ یہی لوگ کائنات میں اچھے اور صحت مند اقدار کی تشہیر وتبلیغ میں ممد ومعاون ہوسکتے ہیں اور انہی کے دم سے بہتر اور حسین نظام وجود میں آسکتا ہے۔ وہ نوجوانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرتے ہیں اور یہ احساس دلاتے ہیں کہ زمانہ قیامت کی چال چل گیا ہے۔ ایسے میں سستی، کاہلی اور پست حوصلگی آسان راہوں کو بھی دشوار کردے گی جب کہ زندگی کی راہ میں بہت ہی پرخطر مقام آتے ہیں۔ بڑی کٹھنائیاں اور دقتیں آتی ہیں۔ اس لیے حقیقی منزل تک رسائی کے لیے ضروری ہے کہ نوجوان غفلتوں کی ردا اتار پھینکیں کہ انہی سے کائنات کی امیدیں وابستہ ہیں:

نوجوانو! یہ غفلتیں کب تک
اب تو موضوع گفتگو تم ہو
اپنے کردار کو جلا بخشو
صاف شفاف آب جو تم ہو
اپنے ہونے کا کچھ ثبوت بھی دو
چاک داماں ہو بے رفو تم ہو

طارق کے یہاں خطیبانہ رنگ وآہنگ ہے، جزالت الفاظ اور پرشکوہ تراکیب کی کثرت ہے۔ ان کی شاعری فکر واسلوب کے نئے دریچے کھولتی ہے۔

نثری منظرنامہ

نثری بیانیہ کے ضمن میں دیوبند کے فیض یافتگان کی فہرست کافی طویل ہوسکتی ہے کہ نثر کے جملہ اصناف واسالیب میں دیوبند کے فضلاء نے جو نقوش مرتسم کئے ہیں، وہ ناقابل فراموش ہیں بلکہ یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ نثر کو ندرتیں عطا کی ہیں اور نثری اسالیب کو نئے آہنگ دیئے ہیں۔

نثری اسالیب میں جن اختراعات اور ابتکارات کا ثبوت فضلاء دیوبند نے دیا ہے، اس کی مثالیں معاصر اردو نثر میں خال خال ملتی ہیں۔ دیوبند سے جڑے نثر نگاروں کی نثر کا انداز الگ ہوتا ہے۔ اس میں معروضیت، منطقیت اور علمیت ہوتی ہے۔ ان کی لنگویج میں لاجک ہوتی ہے، ٹھوس،

پختہ فکر آ گئیں اور کسی حد تک تخلیقیت افروز بھی۔ گو کہ عام نثر میں علمی انداز نمایاں ہے مگر بعض نثر نگاروں کے ہاں تخیل اور اظہار کی وہ زیبائی ہوتی ہے کہ ان کی نثر میں 'کلامیہ' کے سارے عناصر نظر آتے ہیں۔ دیوبند کی نثر اپنی تکنیک اور اسلوب کے اعتبار سے نہایت ٹھوس، مستحکم اور علمی ہوتی ہے۔ اس میں محض تخیل کا رنگ نہیں بلکہ حقیقت کی عکاسی ہوتی ہے اور کسی نہ کسی بنیادی حقیقت کا انکشاف کرتی ہے۔

دیوبند میں صاحب اسالیب نثر نگاروں کی کمی نہیں، کتنے صاحب طرز ادیب ہیں جو اپنی نثر کے جادو سے قاری کو مسحور کرتے ہیں اور دل و دماغ کی دنیا بدل دیتے ہیں۔ تقلیب فکر و نظر میں بھی ان کی نثر کے آہنگ کا اثر نظر آتا ہے اور ان کی نثر میں کئی زبانوں کا امتزاج بھی ہوتا ہے۔ بالخصوص عربی اور فارسی آہنگ سے ان کی نثر میں جو حسن و جمال پیدا ہوتا ہے، اس حسن کی تعبیر، تفسیر ممکن نہیں۔ قرآنیات اور قدیم عربی ادبیات اور فارسی شعریات سے ارباب دیوبند کی نثر، عام نثر نگاروں سے مختلف اور متمائز ہو جاتی ہے۔

سوانح نگاری ہو یا خودنوشت، خاکے ہوں یا سفرنامے، جملہ نثری اصناف میں فضلاء دیوبند کی خدمات کا جائزہ لیا جائے تو محسوس ہوگا کہ ان اصناف کے جملہ لوازمات کی تکمیل ان کی تحریروں میں جس طور پہ نمایاں ہے، وہ کم نثر نگاروں کے ہاں ملتی ہے۔

سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ لفظوں کے درو بست درست ہوتے ہیں۔ جملوں کی ساخت تندرست اور مستحکم ہوتی ہے جب کہ عربی، فارسی سے ناآشنا نثر نگاروں کی زبان مومو جومو بن جاتی ہے۔

سوانح نگاری کی نثری صنف میں مولانا مناظر احسن گیلانی کی کتاب ''سوانح قاسمی'' ایک مثالی حیثیت رکھتی ہے جس میں سوانح نگاری کے جملہ آداب، اصول اور ضوابط کا خیال رکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مولانا حسین احمد مدنی کی خودنوشت ''نقش حیات'' بھی قابل ذکر ہے۔ ادبی اور علمی دونوں اعتبار سے اِس کا شمار اہم خودنوشتوں میں کیا جاسکتا ہے۔ گو کہ تنگ نظر ناقدین اس کے ذکر سے اعراض کرتے ہیں مگر حقیقت میں دیکھا جائے تو خودنوشت کے فنی تقاضوں پر یہ کتاب پوری اترتی ہے جس میں مولانا نے نہ صرف اُس عہد کو زندہ کر دیا ہے بلکہ اُس عہد کی پوری سیاسی اور سماجی تاریخ بھی اس کتاب میں سما گئی ہے۔ اس لحاظ سے ''نقش حیات'' ایک مقصدی خودنوشت ہے۔ نہ کہ نرگسیت کی شکار کسی تخلیق کار کی خودستائی یا خود بینی کی مظہر!

سفرنامہ کا شمار بھی صنف ادب میں ہوتا ہے۔ بقول مرزا حامد بیگ ''یہ واحد ایسا نثری صنف

اظہار ہے جس کی تکنیکی تعریف کا تعین تا حال ممکن نہ ہوسکا۔'' سفرنامے کے ذیل میں مولانا عبیداللہ سندھی کا سفرنامہ '' کابل میں سات سال''اور مولانا حسین احمد مدنی کا مرتب کردہ ''سفرنامہ شیخ الہند'' سفرنامہ برما، سفرنامہ افغانستان، سفرنامہ مقامات مقدسہ (قاری محمد طیب) سفرنامہ مصر و حجاز (منت اللہ رحمانی) زیارت الشام والقدس (عاشق الٰہی میرٹھی) کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ مولانا عبدالصمد صارم کا سفرنامہ ''سفرنامہ صارم'' اور ''سفرنامہ حج و زیارت'' اس اعتبار سے قابل ذکر ہیں کہ حج سے متعلق لکھے گئے سفرناموں میں یہ زیادہ معتبر اور مستند ہیں۔

مولانا عبیداللہ سندھی کا سفرنامہ '' کابل میں سات سال'' نہایت اہمیت کا حامل ہے کہ اس سفرنامہ سے افغانستان کی سیاسی تہذیبی صورت حال کا پتہ چلتا ہے اور ہندوستانی قائدین کی سیاسی جدوجہد کا بھی۔ مولانا نے کابل کا سفرنامہ لکھتے ہوئے وہاں کے تہذیبی، لسانی اور فکری تمام منازل اور مقامات کی اچھی نشان دہی کی ہے۔ اس اعتبار سے افغانستان کی سیاسی، تہذیبی تفہیم کے سیاق و سباق میں یہ سفرنامہ بہت مفید ہے۔ چند ایک اقتباسات سے مولانا کے طرزِ بیان اور ان کی اساسی فکر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> '' سلطنت کے اساسی نظام میں دہلی کے اکبر شاہی نظام کے دھندلے نشان ملتے ہیں۔ سالوں کے نام اور سنہ اور ہندو مسلمانوں کو برابر سمجھنا اور نوکریوں میں برابر جگہ دینا یہ اکبر شاہی نظام کے نشان ہیں۔''

اس اقتباس سے موجودہ کابل کی تقلیب کا اندازہ کیجئے اور یہ محسوس کیجئے کہ وہی کابل جہاں اکبر شاہی فکر حاوی تھی اور رواداری ذہنوں پر غالب۔ وہاں بدلتے زمانے کے ساتھ تشدد اور جارحیت کیوں پیدا ہوئی، اس کے اسباب وعلل پر غور کیا جائے تو بہت ساری حقیقتیں خود بخود روشن ہوجائیں گی۔

اسی طرح ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

> '' دارالسلطنت کابل کا لفظ اصل میں گاؤ پال تھا۔ یہاں گاؤ رکھشا کا ایک مندر تھا جو بگڑ کر کابل ہوگیا۔ دارلسلطنت کابل میں ایرانی، افغانی، ترک، اور ہندی آباد ہیں۔ ہندوستان کے ہندو اور مسلمان تجارت کے لیے افغانستان میں کثرت سے ہیں۔ سندھی ہندو اور پیشاوری مسلمان ممتاز نظر آتے ہیں۔ پیشاور میں مسلمانوں کا ایک حصہ انگریزی سرمائے سے تجارت کرتا ہے۔ ان کے گماشتے افغانستان پر چھائے ہوئے ہیں۔'' (کابل میں سات سال، ص:۱۵۴)

دیوبند نے نثری اظہارات کو نئے امکانات بھی عطا کیے اور نثر کو علمیت، معروضیت اور استدلال سے آشنا کر کے اُس کی افادیت کی راہیں وسیع کر دیں۔ دیوبند نے جو نثر لکھی اس میں حقائق کا اظہار زیادہ ہوتا ہے اور بیشتر نثر علمی اور فکری کے ذیل میں آتی ہے۔ غیر ضروری تخیلات یا بیجا تمہید طولانی سے دیوبند کی نثر نے اجتناب برتا ہے اور اس طور پہ دیوبند کی نثر کا رنگ اور آہنگ دوسروں سے الگ اور مختلف ہے اور اس نثر کا رشتہ چونکہ عوام سے ہے اس لیے انہوں نے اِس میں مذہبی، اخلاقی مسائل و مباحث کو سمونے کی زیادہ کوشش کی اور الفاظ کے اسراف سے گریز کیا۔ دیوبند کی مقصدی اور افادی نثر نے ہی اسے طبقہ عوام میں مقبول و معروف بنا دیا اور ان کی تصنیفات کو مرجعیت عطا کی۔

دیوبند کے اہم نثر نگاروں میں مولانا قاسم نانوتوی سے لے کر آج تک کے وہ نثر نگار شامل ہیں جنہوں نے نثری بیانیہ کو استحکام، تنوع اور تلون عطا کیا ہے۔

ایسے نثر نگاروں میں مولانا مناظر احسن گیلانی، سعید احمد اکبر آبادی، تقی عثمانی، عامر عثمانی، رضوان القاسمی، بدرالحسن قاسمی، نور عالم خلیل الامینی وغیرہ وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

دیوبند نے نثر کی کئی نئی جہتوں کا اکتشاف کیا ہے اور نثر میں نئے تجربے بھی کئے ہیں۔ اس ضمن میں محمد ولی رازی کا نام نمایاں ہے جنہوں نے علم بدیع کی ایک مشکل صنعت (غیر منقوط) میں کتاب لکھی ہے۔ ایسے تجربوں کے لئے زبان پر عبور اور علم کامل ضروری ہے''ہادی عالم'' نثر کا ایک نہایت مشکل تجربہ ہے اور اپنے اظہاری تجربے کے اعتبار سے یہ اردو ادب میں گراں قدر اضافہ بھی ہے۔ گو کہ قدیم زمانے میں انشاء اللہ خاں انشائے'' سلک گہر'' میں ایسا ہی نثری تجربہ کیا ہے اور'' طور الاسرار'' میں نظمیہ تجربہ، مگر'' ہادی عالم'' کی بات ہی کچھ اور ہے۔ یہ نثر کی ایک نئی جہت کی اطلاقی شکل ہے جو'ہادی عالم' کی صورت میں نمایاں ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیانیہ نثر کے اس تجربے کو ارباب ادب نے سراہا اور اس نثری ریاضت کی تحسین کی، ڈاکٹر سید محمد عبداللہ جیسے ممتاز ناقد اور صاحب نظر نے یہ اعتراف کیا:

> '' مولانا محمد ولی رازی نے ایک ایسا کارنامہ انجام دیا ہے جس کی مثال اردو زبان میں موجود نہیں ـــــ حضرت رسول کریمؐ کی مکمل زندگی غیر منقوط حروف کی ترکیب و ترتیب سے اردو میں لکھ کر اپنی ذہانت و فطانت کا کمال کر دکھایا ہے۔ علم بدیع کی ایک مشکل صنعت (غیر منقوط) کو مکمل طور سے بامعنی عبارتوں میں استعمال کر کے جانفشانی کا ایک ایسا نادر نمونہ پیش کیا ہے جسے اردو زبان کے ذخیرے میں ایک بیش بہا اضافہ قرار

دیا جاسکتا ہے۔''

تو ڈاکٹر عبدالحئی نے یوں تحسین وستائش کی:

''ادیبانہ انداز میں سیرت کے موضوع پر ''ہادی عالم'' اپنی شان انفرادیت کا ایک عجیب شاہکار ہے— اپنے انداز کی ندرت وجدت کے اعتبار سے زبان اردو کے خزینہ ادب کے لئے سرمایہ فخر ومباہات ہے۔ اس کتاب کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ ابتداء سے انتہاء تک جس قدر مضامین معرض تحریر میں آئے ہیں، ان کے کسی حرف پر نقطہ نہیں ہے۔ ماہرین علم وادب ونکتہ سنجان فکر ونظر جو اس کتاب کا مطالعہ کریں گے تو ان کو جس طرح ادب اردو کی وسعت و جامعیت پر تعجب ہوگا، اس طرح ادب اردو پر مصنف کے عبور کامل اور اسلوب نگارش کی جدت پر بھی حیرت ہوگی۔''

ارباب نظر خود بھی اس نثری تجربے سے یوں محظوظ ہوسکتے ہیں:

''ہادی کامل صلی اللہ علی ورسولہ وسلم سارے رسولوں کے سردار ہوکر اہل اسلام کی اصلاح کے لیے سراسر کرم وعطا ہوکر آئے۔ اک معلوم عرصہ کے لئے اس عالم مادی میں آکر رہے۔ لوگوں کو راہ ہدی دکھائی۔ اسلام کے احکام واسرار عطا کئے۔ لوگوں کو حلال وحرام کا علم عطا ہوا۔ عدل وصلہ رحمی، عطا وکرم ہمدردی و مددگاری کا عمل عام ہوا۔ لوگوں کی اصلاح کا اہم کام مکمل ہوا۔ اگلے لوگوں کے لئے ہر ہر گام کے لئے اسوہ مطہرہ عطا ہوا۔ اسی لئے سارے دوسرے رسولوں کی طرح سرور عالم کے لئے حکم وصال آکر رہا۔ (رسول اللہ کا وصال مسعود)

''اللہ اللہ! وہ رسول امم موجود ہوا کہ اس کے لئے صدہا سال لوگ دعا گو رہے۔ اہل عالم کی مرادوں کی سحر ہوئی۔ دلاں کی کلی کھلی، گمراہوں کو ہادی ملا۔ گلے کو راعی ملا، ٹوٹے دلوں کو سہارا ملا، اہل درد کو درماں ملا، گمراہ حاکموں کے محل گرے، سالہا سال کی دہکی ہوئی وہ آگ مٹ کے رہی کہ لاکھوں لوگ اس کے آگے سر لگائے رہے۔''

(مولود مسعود)

۲

دیوبند کے اہم اور مختلف لسانی اظہار کے حامل نثر نگاروں کی فہرست طویل ہے، کچھ اہم نثر نگاروں کا یہاں تذکرہ کیا جارہا ہے تاکہ دیوبند کے اسالیب نثر سے ناقدین آشنا ہوسکیں اور نثری

امتیازات پر گفتگو کرتے ہوئے ان کی نثر کے نمونوں کو بھی سامنے رکھیں۔ایسے نثر نگاروں میں مولانا مناظر احسن گیلانی، رضوان القاسمی، سالم قاسمی، انظر شاہ کشمیری کے نام بطور خاص لیے جاسکتے ہیں جن کا نثری آہنگ بہت مختلف اور ممتاز ہے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی

بیانیہ نثر کے جمال کی دوشیزگی میں اپنے بے نظیر، منفرد اسلوب سے اضافہ کرنے والوں میں مناظر احسن گیلانی (م ۱۹۵۶ء) کا نام نمایاں ہے۔انہوں نے لطافت بیان اور سلاست زبان سے اپنی تحریر کا رشتہ عوام وخواص کے دل و دماغ سے براہِ راست جوڑ دیا ہے۔ان کی نثر کا آہنگ دلوں کو ارتعاش بھی عطا کرتا ہے اور جذب و جنوں کی اس کیفیت سے بھی گزارتا ہے جو ان کی الیلی نثر کا ایک غیر منفک عنصر ہے۔

مناظر احسن گیلانی کی نثری زبان کی ساخت، دیگر نثر نگاروں سے مختلف ہے، متخیلہ اور متفکرہ کے امتزاج سے ان کی نثر کی تشکیل ہوئی ہے۔ان کی نثر میں کلامیہ عناصر کی فزونی کی وجہ سے کہانویت اور داستانویت بھی در آئی ہے۔یہ امتیاز ان کے معاصر نثر نگاروں میں بہت کم لوگوں کو حاصل ہے۔ان کی نثر کی سب سے بڑی خوبی برجستگی اور بے ساختہ پن ہے۔وہ ایجاز واطناب بلکہ استطر اد دونوں طریق کار کا استعمال اپنی نثر میں کرتے ہیں اور موضوع کے مقتضیات کو پیش نظر رکھتے ہیں۔

وضاحت عبارت، متانت فکر نے ان کی تحریروں کو ادبی اور علمی دونوں حلقے میں اعتبار عطا کیا ہے اور ان کی نثر کے شیدائیوں کا ایک بڑا حلقہ دونوں طرف ہے۔سید سلیمان ندوی، عبدالماجد دریا بادی، ماہرالقادری جیسے سخن فہم، ادب شناس نے ان کی تحریروں میں نئے تموج اور ان کی لفظیات کی جولانی کی ستائش کی ہے اور ان کے طرز اظہار کو یکسر مختلف اور منفرد قرار دیا ہے۔

مناظر احسن گیلانی کی نثر کے جادوئی طلسم میں بہت سے لوگ اسیر ہیں اور صرف یہی نہیں کہ انہوں نے نثر کو جلال و جمال عطا کیا بلکہ اردو کی لفظیات اور تراکیب میں گراں قدر اضافہ بھی کیا ہے۔انہوں نے اردو کو نئے الفاظ بھی عطا کئے ہیں اور اردو کی محدود ڈکشن کی توسیع کا فرض بھی ادا کیا۔

ان کی تصنیفات 'النبی الخاتم' سوانح قاسمی۔حضرت ابوذر غفاری، الدین القیم، امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی، میں علمیت کے ساتھ ادبیت کا وہ رنگ اور اسلوب بھی روشن نظر آتا ہے جو صرف انہی

سے مخصوص ہے۔ علمی اور ادبی دونوں معیارات پر پرکھنے سے ان کتابوں کی قدر و قیمت اور بڑھ جاتی ہے۔ جہاں ادب کی نکتہ آفرینیاں ہیں وہیں علمی حقائق و دقائق بھی ہیں۔ ادب اور علم دونوں موجیں ایک ساتھ رواں دواں ہیں۔ ان کی نثر کا کوئی بھی ٹکڑا ادبی لطف سے خالی نہیں اور نہ علمی نکتہ سے عاری ہے۔

ان کی نثر میں جو قوت، تاثیر اور تابندگی ہے، اس میں بہت کچھ دخل مختلف ادبیات سے آگہی اور لسانیات کے تعامل کا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے بالکل سچ لکھا ہے کہ ''وہ ایک خاص طرز انشاء کے مالک تھے اور اس میں کسی کے مقلد نہیں۔ خود اس کے موجد تھے۔''

ان کی نثر میں ان کی تخلیقی فطانت اور ذہنی ذکاوت کے ساتھ خون جگر کی نمود بھی ہے جس نے ان کی تحریر کو تاثیر عطا کی ہے۔ القاسم، الرشید دیوبند میں شائع شدہ مضامین ان کے وہ ادبی شاہکار ہیں جن کا لسانی تجزیہ کیا جائے تو بہت سی حیرتوں کے در وا ہوں گے اور یہ پتہ چلے گا کہ نثر کی جو بوطیقا یا نثر کی شعریات مولانا نے تشکیل دی ہے، وہ شعریات منجمد نہیں بلکہ متحرک اور سیال ہے اور یہی ہمارے اس عہد زوال کے لئے نثر کا ایک ماڈل بھی ہے کہ ادب سے آگہی نے علم کے بحران کو جنم دیا ہے جب کہ یہ نثر، ادب اور علم کے امتزاج سے معاشرہ کی منفیت اور مجہولیت کا ازالہ بھی کرتی ہے اور لسانی لذتوں سے ہمکنار بھی۔ ہمارے عہد کو نثر کے ایک ایسے ماڈل کی ضرورت ہے جو معاشرتی تقاضوں سے ہم آہنگ ہو اور جو لسانی آگہی کے ساتھ ازدیادِ علم کا وسیلہ بھی ہو۔ علم اور ادب کی تقطیب اور تفریق نے نثر کو جس زبونی اور شکستگی سے دوچار کیا ہے۔ ایسے میں یہ علمی ادبی نثر، اسے بہت بڑے علمی، ادبی بحران سے بچا سکتی ہے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی کی نثر میں سوز دروں کی کیفیت کو اس عبارت میں محسوس کیا جاسکتا ہے:

(الف) ''اسی دلی میں جہاں مسلمانوں کا لال قلعہ اور جامع مسجد ہے، اسی کے متعلق غالب اپنے خط مورخہ ۵/دسمبر ۱۸۵۷ء میں اپنے اس احساس اور اندیشہ کو قلم بند کرتا ہے ''دیکھا چاہئے مسلمانوں کو آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں'' ان ہی خطوط میں دلی کے اسی شہر آشوب کے متعلق غالب نے اپنی ایک ماتمی نظم کے چند اشعار کا بھی تذکرہ کیا ہے:

بس کہ فعال ما یرید ہے آج   ہر سلحشور انگلستان کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے   زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے   گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک   تشنۂ خوں ہے ہر مسلمان کا

غالب نے جو کچھ دیکھا تھا، دلی ہی میں دیکھا تھا۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ ان اشعار میں درحقیقت ملک کے اکثر حصوں کی تصویر کھینچ آئی ہے۔ دلی اور دلی والوں پر جو کچھ گزر رہی تھی تقریباً سارے ماؤف آسیب رسیدہ علاقوں کا حال یہی تھا۔ اس برپا ہونے والی قیامت کے ہنگاموں سے بچ نکلنے کی ایک مختصر راہ تو وہی تھی جو حافظ شہید کو میسر آئی۔ بندوق کی گولی۔ صرف ایک گولی نے سارے قصوں کو صرف ختم ہی نہیں کر دیا بلکہ محمد رسول اللہ ﷺ اور ان کی وحی قرآنی سے علمی ربط قائم کر لینے کے بعد جو کچھ دکھایا جاتا ہے اور دیکھنے والے جو کچھ دیکھتے ہیں ان کی نگاہوں کے سامنے سے اس جاں نواز نظارے کو کون ہٹا سکتا ہے کہ مغلوں کی حکومت ہو یا پٹھانوں کی، خلجیوں کی ہو یا غوریوں کی، الغرض کوئی بھی حکومت مشرقی ہو یا مغربی، جباری ہو یا جمہوری، فرعونی یا اشتراکی جسے مہیا نہیں کرسکتی بلکہ مہیا کرنے کا خیال بھی نہیں کرسکتی۔ حافظ شہید امن و عافیت کی ان ہی لازوال راحتوں سکھ اور چین کی ان ہی نہ ختم ہونے والی لذتوں میں زندگی گزار رہے ہیں۔'' سوانح قاسمی، جلد دوم، ص: ۱۶۵-۱۶۶)

(ب) مرزا غالب جس زمانہ میں گا رہے تھے کہ:

موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا

اس زمانے میں دیکھنے والوں نے چشم سر سے دیکھا کہ واقعی کسی کے سر سے خون کی موج ابل رہی ہے۔ پوچھنے والے پوچھ رہے ہیں کہ کیا ہوا اور وہ (حضرت قدس سرہ نانوتوی) مسکراتے ہوئے کہہ رہا ہے کہ کچھ نہیں ہوا، کچھ نہیں ہوا، رو در رو ہو کر اس کے چہرے پر گولی چلائی گئی، بندوق کی گولی چلائی گئی۔ مونچھ اور داڑھی کا بھی کچھ حصہ جل گیا۔ آنکھوں کو بھی چشم زخم پہنچا لیکن جو آگے بڑھنے ہی کے لئے میدان میں اترا تھا، وہ سن مکھ اسی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا، جدھر جانے کا وہ فیصلہ کر چکا تھا۔ طوفان کا رخ پھیرا جائے گا، جو اندھیرا پھیلا ہے اس کو روشنی سے بدلا جائے گا۔ اس کا یہ عزم صمیم اب بھی تر و تازہ تھا۔ اس کی امنگوں کا جوش اب بھی باقی تھا بلکہ شاید کچھ زیادہ تیز، زیادہ قوی ہو گیا تھا۔ ۱۸۵۷ء تک تو اس کے ہاتھ میں تلوار بھی تھی، اس ہنگامہ کے فرو ہو جانے کے بعد تو یہ تلوار بھی چھن گئی اور غالب ہی کے الفاظ میں:

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

آہنی، نظریاتی و طلائی الغرض سارے ہتھیار جن سے کام لیا جاتا ہے، وہ سب ہی سے نہتا ہو چکا تھا۔ لیکن اس کے ارادے کی بلندیاں اب بھی باقی تھیں حالانکہ وقت تنگ ہو چکا تھا لیکن اس تنگ وقت میں اس سے جو کچھ ہو سکا، کر گزرا، اس کی بھی کوشش بازآور اور سعی مشکور ہوئی۔ یوں اسلامی ہند کی تاریخ میں ایک مستقل دینی و علمی تحریک کی بنیاد پڑ گئی، یہ وہی دینی و علمی تحریک ہے جو ضلع سہارن پور کے قصبہ دیوبند کی طرف منسوب ہو کر ''دیوبندیت'' کے نام سے عوام و خواص میں موسوم و مشہور ہوئی۔''

(سوانح قاسمی، جلد دوم، ص: ۲۰۹-۲۱۰)

مولانا مناظر احسن گیلانی صاحب طرز ادیب تھے۔ بے نظیر، بے مثال نثر کے موجد مگر ادبی حافظے کا حصہ نہیں بن سکے۔ آخر اس سازش کے پیچھے کون سی قوت کارفرما ہے؟ اس کا سراغ لگایا جانا ضروری ہے تاکہ ادبی تاریخ، تعصب اور تحفظ کی مزید آلودگی سے محفوظ رہ سکے — آج کے ادبی معاشرہ کے سامنے یہ بھی ایک بڑا سوال ہے؟

مولانا محمد سالم قاسمی

مولانا محمد سالم قاسمی کے نثری آہنگ پر 'شعری آہنگ' کا قطعی کوئی اثر نہیں ہے۔ ان کی نثر نہ مقفیٰ ہے نہ مسجع اور مرجز بلکہ ان کی نثر خالص علمی اور منطقی ہے۔ تکلف، تصنع اور تخیل سے ماورا ٹھوس اور منجمد حقائق کو پیش کرنے والی نثر، بالکل سائنسی انداز کی۔ ان کے ہاں زبان کا سائنسی استعمال ملتا ہے۔ صنائع، بدائع، تشبیہات و استعارات سے ان کی نثر کا رشتہ دور کا ہے۔ مقامات کی طرح مقفیٰ نہیں بلکہ مقدمہ ابن خلدون اور ولی اللٰہی اسلوب اور اظہار کی طرح ان کے ہاں علمیت اور معروضیت ہے۔ نغمہ بار اسلوب سے احتراز نے ان کی نثر کے آہنگ کو منطق، فلسفہ، کلام سے زیادہ قریب کر دیا ہے۔ وہ تاثر اور کیف پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ دقیق سادہ نثر میں اپنے خیالات اور احساسات کی ترسیل کرتے ہیں اور عربی، فارسی تراکیب اور لفظیات کا استعمال کرتے ہیں۔ عام قاری کو ان کی نثر مغلق اور پیچیدہ اور قدرے مبہم معلوم ہوگی مگر باشعور اور بالغ قاری کے لیے ان کی نثری ساخت کی تفہیم زیادہ دشوار نہیں ہے۔

ان کے افادی، معلوماتی اور مستحکم نثر کی شناخت اس اقتباس سے کی جا سکتی ہے:

''جس طرح دنیا کے مختلف خطوں اور ملکوں میں بود و باش رکھنے والی قومیں قبول اسلام کے بعد اس کی مکلف ہیں کہ وہ اپنے فکر و عمل کو اسلامی تعلیمات کا پابند بنائیں اس

طرح وہ اسلام کے صحیح احکام واعتقادات کی ترجمانی بھی صحیح اور موثر تعبیر میں کرنے کی مکلف ہیں۔ اس صحت ترجمانی اور تعبیر موثر کا نام ادب ہے جو اسلامی نقطہ نظر سے بذات خود ایک اہم اور مہتم بالشان اسلامی عمل، اسلامی ضرورت اور اسلامی فن بن جاتا ہے۔''

اس نثر میں صوتی آہنگ نہیں ہے مگر منطقی اور فکری تسلسل ہے جس کی وجہ سے یہ نثر اپنے بنیادی مقصد میں اور خیالات کی ترسیل میں کامیاب ہے۔ لفظوں کے مابین وہ تسلسل اور ربط نہیں ہے جو ادبی نثر کا خاصہ ہے لیکن 'موضوعاتی موزونیت' نے اس نثر کو تمکنت کے ساتھ ساتھ افادیت اور استقامت عطا کی ہے اور قاری کے ذہن کی اس جہت کو متحرک کیا ہے جو استدلالی اور منطقی ہے۔

مولانا سالم قاسمی کی نثر کا ایک اور نمونہ جو ان کے نثری نظام کی نوعیت، ماہیت اور مزاج کی تفہیم میں معاون ہو سکتا ہے:

''حضرت شاہ ولی اللہ کا حقیقی مطمح نظر جو ان کے علوم سے وجداناً مفہوم ہوتا ہے وہ بصورت عدم اقتدار، ملت اسلامیہ میں اس اجتماعیت کبریٰ کی تولید ہے کہ جس کے فقدان کے نتائج نے ہر دائرہ حیات کو علمی اور عملی بدترین پستیوں سے دوچار کر دیا ہے۔ اس کا دفاع اس کے اصل سرمنشا سے واقفیت کے بغیر ممکن نہیں۔''

''تخریب پسند طاقتوں نے اپنی خودغرضانہ خواہشات کے تحت کبھی اسلام کے اعتقادی مسائل کو ہدف بنایا، کبھی طاعات وعبادات کو، کبھی اسلام کے نظام عدل ومساوات پر اپنے فکری عناد کی پوری قوتیں صرف کیں تو کبھی نظام اموال پر ہاتھ کی صفائی دکھائی۔''

یہ نثر وہی لکھ سکتا ہے جسے موضوع کے مالہ وماعلیہ پر مکمل درک ہو اور جس کے ذہن کی ساری کھڑکیاں کھلی ہوں۔ جس کا ذہن محشر خیال ہو۔ جس کے پاس خیالات ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوں۔ یہ نثر ایک ہمہ جہت ذہن رکھنے والا حاضر دماغ فرد ہی لکھ سکتا ہے جو متعلقہ موضوع کے ممکنہ جوانب و جہات سے بھی آگہی رکھتا ہو۔

انظر شاہ کشمیری

لفظیات اور فکریات کے اعتبار سے اپنی نشانیات (Semiotics) سے جڑے ہوئے انظر شاہ کشمیری کی نثر میں طلسمی کیفیت ہے۔ اردو میں ایسی پُردم، بلند آہنگ نثر لکھنے والے کم ہیں جن کے جملوں کے زیر وبم اور موسیقیت سے وہ اذہان بھی متاثر ہوتے ہیں جو لفظوں کے معانی ومفاہیم تک رسائی سے قاصر رہتے ہیں۔ ان کی نثر کی رمزیت اور اسراریت میں وہ کیفیت ہے کہ قاری اس کے

سحر سے نکل نہیں پاتا اور اس کا ذہنی وجود، نثر کے موجِ رواں میں جذب ہو جاتا ہے۔
انظر شاہ کشمیری کی نثر میں 'شاہین' کی سی بلند پروازی ہے۔ یہ ایسی نثر ہے جو وجود میں حرارت اور برقی رو دوڑا دیتی ہے۔ ان کی تحریر میں ''ضربت غازیانہ'' ہے۔ ماضی اور مابعد الطبعیات سے مربوط ان کی تحریروں میں کھوئی ہوئی لوح کی تلاش کا عمل نمایاں ہے۔ ان کی نثر میں مصطفیٰ کامل کی طرح جذبات کی برانگیختگی کا عنصر بھی ہے، سعد زغلول کی طرح ذہانت اور طلاقت لسانی، لطفی سید کی طرح منطقیت اور معروضیت، کئی اسالیب کا امتزاج، مسجع و مقفی نثر اور ترسیلی قوت سے معمور اور سب سے بڑی خوبی یہ کہ وہ دوسروں کے خرمن کے خوشہ چیں نہیں بلکہ خود تخمی کے قائل ہیں۔ اس لیے ان کا طرزِ اظہار اور احساس سب سے الگ اور مختلف ہے۔ نثر میں ایک نئی رہ گزر کی تلاش نے انہیں اپنے اقران میں امتیاز کے ساتھ۔ ان کی تحریر میں رعنائی افکار اور لذت اسرار بھی پیدا کر دی ہے۔
ان کے لسانی نشانات کی شناخت آیات قرآنی، احادیث، عربی، فارسی تراکیب اور لفظیات سے ہوتی ہے۔ ان کی نثر کا ساختیاتی تجزیہ کیا جائے تو یہ پتہ چلے گا کہ نثر میں شعری صنائع کا ہنر مندانہ استعمال کیسے کیا جاتا ہے۔ تلمیحات، علامات، تجنیس و تعلیل — اور دیگر صنائع و بدائع، ان کے لسانی ادراک و عرفان، علوم بلاغت و بیان پر عبور کا ثبوت بھی ہیں اور مطالعہ کی وسعت کا غماز بھی۔
ان کی تحریر کی جولانی، طغیانی اور صوتی مد و جزر کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے جو ان کے لسانی اظہاری نظام کا نمائندہ شاہکار ہے:

> ''قرآن کریم پندرہ سو سال سے جس انسانیت کو جگا رہا ہے، انسان کو جھنجھوڑ کر جس طرح بیدار کر رہا ہے، اس کے طریقہ کار میں نہ کوئی تبدیلی نہ کوئی تغیر۔ یہ کتاب اس درجہ مقدس تھی جس کے مضامین جہاں محفوظ کئے گئے، حفاظتی انتظامات اتنے کڑے تھے کہ کسی انسان کی پرواز تو درکنار شیطان بھی اپنی شیطنت کے باوجود نہیں پہنچ سکا۔ اس کو پہچانے کے لئے بھی قوی ترین ذریعہ روح الامین کا اختیار کیا گیا: ''نزل به الروح الامین' انہ لقول رسول کریم ذی قوۃ عند ذی العرش مکین، مطاع ثم امین'' یہ گوشہ بھی نہیں چھوڑا کہ جو وقت اس کے نزول کا طے کیا وہ بارہ مہینوں میں سب سے زیادہ مقدس مہینہ ''شهر رمضان الذی انزل فیه القرآن''، ''نور علی نور''، ''انا انزلناه فی لیلة القدر'' رمضان کیا ہے؟ بشری خواہشات کے طوفان و طغیان پر شریعت کا مضبوط بند جسے نہ سیل ارم زیر آب کر سکے نہ سمندر کی طغیانی متاثر کر سکے۔ خیر کا غلبہ، شر مغلوب، جود و کرم کی بارشیں، داد و دہش کا ابر کرم، مواسات و غم خواری کا بازار گرم،

ملکیت کے علم بلند، شیطنت کے جھنڈے سرنگوں۔ یہ سب اشارے تھے کہ قرآن کریم کے لیے مقدس ماحول، فکر کی ذہنی تقدیس اس سے اصلاح پذیر ہونے کے لیے شر کو دبانا اور خیر کو اچھالنا یہ سب کچھ اسی وقت حاصل ہوگا جب کہ اس ''الکتاب'' کو یہ سمجھ کر پڑھا اور پڑھایا جائے کہ خدا تعالیٰ براہ راست مجھ سے مخاطب ہے۔ بقول علامہ اقبال:

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

(مسند الہند اور فہم حدیث)

(مشمولہ امام شاہ ولی اللہ اور ان کے افکار و نظریات مرتبہ: عطاء الرحمٰن قاسمی، ص: ۳۷)

رضوان القاسمی

رضوان القاسمی کا شمار بھی اردو کے اہم نثر نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ اپنے خطیبانہ آہنگ اور عالمانہ رنگ کی وجہ سے ممتاز ہیں۔ عربی، فارسی، اردو ادبیات سے آگہی نے ان کی تحریر کو تمکنت، تمازت اور جلالت عطا کی ہے۔ وضاحت فکر اور سلاست اظہار نے نثر میں مقناطیسی کیفیت پیدا کی ہے۔ لفظیات، تراکیب اور عنوانات کے حسن انتخاب کی وجہ سے ان کی نثر کے شیدائیوں کا ایک بڑا حلقہ ہے۔ ان کے تخلیقی جوہر کا ظہور، ان کے شعری عنوانات کے علاوہ ان مضامین میں بھی ہوا ہے جو ادبیات کے تعلق سے تحریر کئے گئے ہیں۔

قدیم کلاسیکی عربی، فارسی، اردو ادبیات سے آشنائی اور استحضار ذہنی کی وجہ سے ان کے مذہبی مضامین میں بھی ادبی رنگ غالب ہوتا تھا اور علمی نثر میں اردو، فارسی، عربی کے اشعار نگینے کی طرح جڑ کر اس کے حسن کو دوچند کر دیتے تھے۔ روزنامہ 'سیاست' حیدرآباد کے ادبی ایڈیشن میں ان کے ادبی نوعیت کے مضامین ان کے تخلیقی توغل اور تنقیدی ادراک کے گواہ ہیں۔ ان کے ادبی شذرات میں بھی علم و عرفان کا دریا ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا تھا۔

رضوان القاسمی کی تحریروں کا لسانیاتی ساختیاتی تجزیہ کیا جائے تو ان کی نثر میں ابوالکلام آزاد، عبدالماجد دریا بادی کی ادبیت، سید سلیمان ندوی کی تاریخی علمیت، شبلی نعمانی کی منطقیت اور معروضیت، خواجہ حسن نظامی کی برجستگی اور لسانی فطانت کا امتزاج نظر آئے گا۔

نہایت سبک اور رواں نثر لکھنے والے رضوان القاسمی نے کئی کتابیں تحریر کیں جن میں 'چراغ

راہ اسرار حیات اور متاع قلم سے ان کی تخلیقی فطانت اور علیمت مترشح ہے۔ 'قرطاس وقلم' اور 'صفا' کی ادارت نے بھی ان کے تخلیقی تحرک اور تسلسل میں اہم کردار ادا کیا ہے اور ان کے ذہن کی زرخیزی کو بانجھ نہیں ہونے دیا۔

دربھنگہ کے متوطن، دیوبند کے فیض یافتہ، دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد کے روح رواں، مسجد عامرہ کے خطیب رضوان القاسمی کی علمی و ادبی صلاحیتوں کا اعتراف ان کے معاصرین نے بھی کیا ہے اور جلال و جمال سے لبریز ان کی نثر کی داد بھی دی ہے۔ عربی کے ممتاز ادیب بدرالحسن القاسمی نے ان کی بلیغ نثر کی ستائش کرتے ہوئے جہاں یہ لکھا ہے 'ادب وانشا کا بہترین ملکہ اللہ نے ان کو ودیعت کیا تھا اور شعروسخن پر بھی ان کو بھرپور دست رس حاصل تھی اس لئے وہ اپنی ہر بات نہایت ہی بلیغ اور موثر طور پر کہنے کا سلیقہ رکھتے تھے' وہیں احمد عبدالمجید قاسمی ندوی نے ان کے مطالعہ کی قوت، استعارات وتلمیحات اور بیان و بدائع کی جامعیت اور اسلوب کی اثر آفرینی کا اعتراف کیا ہے اور ان کی علمی نثر میں تخلیقی رنگ کی تلاش کے سفر میں غالب، اقبال، میر، جگر مرادآبادی، اکبرالہ آبادی، امجد حیدرآبادی جیسے ممتاز شاعروں سے ان کی ذہنی مناسبتوں کا سراغ لگایا ہے اور ان کی نثر کے جمیلی عناصر میں ان افراد کی شاعری کو بھی ایک اہم عنصر قرار دیا ہے۔

۳

دیوبند کا لسانی مزاج مختلف ہے، اس پر علمی اسلوب حاوی ہے۔ اس لیے تخلیقی نثر اور اظہاری اسلوب سے دیوبند کی ذہنی مناسبت ذرا کم ہے کیونکہ تخلیقی نثر بنیادی طور پر شعری خصوصیات کی حامل ہوتی ہے۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی ''تخلیقی نثر میں اجمال اور موزونیت کو چھوڑ کر شعر کے دوسرے خواص موجود ہوتے ہیں۔'' افسانہ ناول اور انشائیے کا شمار خالص تخلیقی نثر میں ہوتا ہے اور ان نثری اصناف سے دیوبند کا رشتہ زیادہ مستحکم نہیں ہے۔ علمی نثر پر ارتکاز کی وجہ سے تخلیقی نثر سے جڑے ہوئے ایسے فن کاروں کی تعداد کم ہے جن کا تعلق دارالعلوم دیوبند سے ہو۔

زبان کا ترسیلی استعمال تو دیوبند نے بحسن وخوبی کیا مگر زبان کے تخلیقی استعمال کی طرف توجہ کم رہی ہے۔ یہ اور بات کہ تخلیقی نثر کے کچھ عناصر ان کی علمی نثر میں بھی در آئے ہیں۔ اس طرح مواد کے ساتھ اظہار کا حسن اور کیف ونشاط بھی شامل ہوگیا ہے۔ آگہی اور اظہار کا یہ حسن امتزاج تو ہے مگر وہ جسے خالص تخلیقی نثر کہتے ہیں، ایسی نثر دیوبند کے منتخب افراد نے ہی لکھی ہے جن میں مولانا شائق احمد عثمانی، مظہرالدین شیرکوٹی، عامر عثمانی، انجم عثمانی اور انوارالوفا کے نام شامل ہیں۔

شائق احمد عثمانی، بنیادی طور پر صحافی تھے مگر انہوں نے ناول نگاری سے بھی اپنا رشتہ قائم رکھا۔ ان کا ناول ''لیلیٰ'' اپنے عہد میں بہت مقبول و مشہور ہوا۔

مظہر الدین شیر کوٹی بھی صحافت سے وابستگی کے باوجود ناول لکھتے رہے۔ ان کے ناول فنی اعتبار سے کسی طرح کے سقم کے شکار نہیں ہیں بلکہ حیرت ہوتی ہے کہ کردار نگاری میں ان کو کمال حاصل تھا اور ان کے مکالموں کا تو جواب ملنا بھی مشکل ہے۔ ایسی برجستگی، بے ساختگی مکالموں میں بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کے مشہور ناولوں میں شیر دل خاتون (تین حصے) سندھ کی راج کماری (۱۳ اجزاء) گجرات کی حسینہ اور حسینہ کابل کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ یہ ناول ایک زمانے میں بہت مشہور ہوئے۔ ان ناولوں سے مظہر الدین شیر کوٹی کی تخیلی قوت اور تخلیقی توانائی کا اندازہ بآسانی لگایا جاسکتا ہے۔

عامر عثمانی کی تخلیقی نثر کا جادو ''مسجد سے میخانے تک'' میں سر چڑھ کر بولتا ہے جس میں اردو کے بنیادی اسلوب یا لسانی نارم سے انحراف کیا گیا ہے۔ طنزیہ مزاحیہ اسلوب میں لکھی گئی یہ تحریریں زبان و بیان پر عامر عثمانی کے عبور کی نشان دہی بھی کرتی ہیں اور وہیں ان کی وسیع تر علمیت اور آگہی کی گواہی بھی دیتی ہیں۔ کرب تصلیب سے گزرنے والے فن کار عامر عثمانی نے اگر تنقید کے میدان میں قدم رکھا ہوتا تو شاید تنقید کے افق پر کوئی دوسرا نام دور دور تک نظر نہ آتا۔ نقاد یا تو تنقید لکھنا بھول جاتے یا پھر کوئی اور پیشہ اختیار کرتے کہ عامر عثمانی کی علمیت کے سامنے ہمیشہ انہیں اپنی جہالت کا چراغ روشن ہونے کا خطرہ لاحق ہوتا۔ طنز و مزاح کے میدان میں بھی انہوں نے پھکڑ پن سے اپنی تحریروں کو دور رکھا اور نہایت تلخ اور زہر میں ڈوبے ہوئے لہجے میں لکھا۔ ان کے طنز کی نشتریت کو برداشت کرنے کے لیے بھی فولاد کا جگر چاہیے۔ ''مسجد سے میخانے تک'' تخلیقی نثر کا عمدہ نمونہ نہیں بلکہ تخلیقی نثر کا عروج اور غرۃ الکمال ہے۔

انجم عثمانی نئے فکشن کا ایسا معتبر نام ہے جس کے بغیر فکشن کی تاریخ ادھوری رہے گی کیونکہ ان کی کہانیوں میں قصباتی فضا کی بازیافت بھی ہے اور وہ اذفر روحانی بھی جس سے آج کی کہانی محروم ہوتی جارہی ہے۔ میر تقی میر کی شاعری میں جو سریت ہے، وہی سریت ان کی کہانی میں بھی ہے۔ ماڈرن فکشن میں جس طرح کا جرنلسٹک اور Crystaline فیشن آچکا ہے۔ ایسے میں رد و روحانیت کی کہانیاں، زیادہ اثر انگیز ثابت ہورہی ہیں۔

Architectonic quality کی وجہ سے بھی انجم کے افسانے الگ امتیاز و اعتبار کے حامل

ہیں۔ انجم کی کہانیاں ہم عصر عہد کے accelerated grimace کے خلاف روحانی ردِ عمل بھی ہیں۔ اس مضحکہ خیزی اور مصنوعیت کے خلاف شدید تخلیقی ردِ عمل جو عالم کاری (عولمہ) کی وجہ سے جدید دنیا کا فیشن بن چکی ہے۔

''ٹھہرے ہوئے لوگ'' ان کا افسانوی مجموعہ ہے جس میں زیادہ تر کہانیاں دیو بند کی قصباتی زندگی سے متعلق ہیں۔ شب آشنا (۱۹۷۸ء)، سفر در سفر (۱۹۸۴ء) ان کے دیگر مجموعے ہیں جو انجم عثمانی کی تخلیقی اور فنی شناخت کے نشانات ہیں۔

انجم عثمانی کی شہرت کئی حوالوں سے ہے۔ ''ٹیلی ویژن نشریات'' پر ان کی ایک کتاب جامعات کے نصاب میں بھی شامل ہے اور بنیادی حوالے کی حیثیت رکھتی ہے جس میں انہوں نے ٹیلی ویژن سے متعلق تمام تفصیلات درج کی ہیں۔ لیکن ان کی بنیادی شہرت ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے ہے اور اس میدان میں انہوں نے بہت جلد اپنی مستحکم شناخت قائم کر لی ہے۔ ممتاز ناقد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے انجم عثمانی کی فنی شناخت کے حوالے سے لکھا ہے:

> ''انجم عثمانی اختصار نویس ہیں، وہ چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھتے ہیں، لیکن واقعیت اور معاشرتی صداقت سے گتھی ہوئی۔ اپنے ہم عمروں میں اختصار و اجمال اور کفایت لفظی کے لیے ان کا ذکر ہوتا ہے۔ وہ اس دنیا میں سرے سے داخل ہوتے ہی نہیں جسے انہوں نے کبھی ''بھوگا'' نہیں۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں اس کھرے پن اور درد کی بنا پر کہتے ہیں جس کے پل صراط کو خود انہوں نے طے کیا ہے۔ مدرسہ دارالعلوم دیو بند کے علمی خانوادے سے تعلق الگ بات ہے، لیکن اس سے تخلیقی رشتہ استوار کرنا یا اس کے تجربے کو فن کی سطح پر اجاگر کرنا زیادہ اہم ہے۔''
>
> ''انجم عثمانی نے اپنے لیے جو تخلیقی گوشہ چنا ہے، آج کے افسانے کی دنیا میں غالباً وہ انہیں کا حصہ ہے اور ہنوز کوئی دوسرا اس گلی کا باسی دکھائی نہیں دیتا۔''
>
> ''شہر گریہ کا مکیں، ورثہ، منظر ابھی نہیں بدلا، گھٹنے والے بابا، گمشدہ تسبیح، چھوٹی اینٹ کا مکان، پیر بھائی یہ سب ایسی کہانیاں ہیں جن کے کردار محض کردار نہیں یا منظر محض منظر نہیں۔ ان میں جو مدرسہ، گلی محلّہ یا قصبہ ہے، وہ محض اتنا نہیں جتنا دکھائی دیتا ہے۔ ان کہانیوں کی معنویت فقط ظاہری معنویت نہیں۔ یوں یہ علامتی کہانیاں بھی نہیں، لیکن یہ اکہری بھی نہیں۔ ان کے بین السطور دبے دبے درد کی لہر چلتی ہے۔ زخمی احساس کی

بھی بھی فضا ہے جس میں مدرسہ، محلّہ، قصبہ محض مدرسہ، محلّہ، قصبہ نہیں رہتا بلکہ ایسی شہ رگ بن جاتا ہے جس میں ہندوستان کی مسلمان اقلیت کے دل کی دھڑکن سنی جاسکتی ہے۔''

''انجم عثمانی ہر چند کہ اپنی تخلیقی شناخت، تہذیبی کرائسس، مسلمان متوسط طبقے کی معاشرت کی فضا سازی اقلیتی معاملات و مسائل کی دردمندی سے قائم کرتے ہیں، لیکن ان کی بعض کہانیوں میں مولسری کا ایک پیڑ بھی اُگتا ہے جس کے پھولوں کی رنگت اور بھینی بھینی بو سے گھر آنگن اور کبھی کبھی پورا معاشرتی وجود مہک اٹھتا ہے۔''

(گوپی چند نارنگ، مدرسہ اور مولسری سے لگی کہانی، مشمولہ: جدیدیت کے بعد)

وفا اعظمی (انوارالوفا) کی پرواز نئی ہے مگر ان کی کہانیاں ہندوستان کے مقتدر اخبارات میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ان کی کہانیوں کے ''کلامیہ'' میں کچھ کمی ہوسکتی ہے مگر اس کے باوجود ان کے ہاں کچھ ایسا ضرور ہے جو قاری کو متاثر کرتا ہے۔ کہانی میں اپنے جذبات اور احساسات کی ترسیل میں کامیاب ہیں۔ ان کی کہانیاں ترسیل کی ناکامی کے المیے کی شکار نہیں ہیں، بلکہ ان میں بھرپور ابلاغی قوت موجود ہے۔ وفا اعظمی کی مشق و ممارست جاری رہی تو ان کی کہانیوں کا روپ اور نکھر سکتا ہے۔

٤

تحقیق و تنقید میں جو زبان استعمال ہوتی ہے وہ ادبی نثر کے زمرے میں آتی ہے۔ اس اعتبار سے ادبی نثر میں تخلیقی نثر کی بنسبت دیوبند کی خدمات کا دائرہ زیادہ وسیع ہے۔ خالص ادبی موضوعات، مباحث اور مسائل پر لکھنے والے فضلاء دیوبند کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ مقتدر مجلات میں فضلاء دیوبند کی جو ادبی تحریریں شائع ہوئی ہیں ان میں ان کا تنقیدی شعور اور ادبی مباحث پر گہری نظر کا پتہ چلتا ہے۔ خاص طور پر اقبالیات اور غالبیات کے تعلق سے فضلاء دیوبند کی تحریریں نہ صرف قابل اعتناء ہیں بلکہ ان میں ایک نیا زاویہ بھی ملتا ہے۔ اقبال اور غالب شناسی کی نئی جہت روشن ہوتی ہے۔ یہ خوش آئند بات ہے کہ فضلاء دیوبند اقبال اور غالب کا مطالعہ اس نہج سے نہیں کرتے جو عصری دانش گاہوں کے اساتذہ اور اسکالرس کا عمومی منہج ہے۔

دیوبند کے ہی فاضل مولانا عبدالصمد صارم ازہری نے غالب کا مطالعہ نہایت باریک بینی اور

دقت نظری سے کیا اور اس نتیجے پر پہنچے:

''مرزا غالب کے اغلاط کو اگر تفصیل سے لکھا جائے تو ان کے دیوان سے زیادہ ضخیم کتاب تیار ہو جائے۔ ان کے کلام میں لغت، صرف و نحو اور عروض غرض ہر قسم کی غلطیاں ہیں۔ ان کی لغزشیں اور غلطیاں اس قسم کی ہیں جو کم علم اور نوآموز شاعر سے سرزد ہو سکتی ہیں۔''

انہوں نے یہ بھی لکھا کہ:

''غالب کا اردو دیوان نہایت مختصر ہے اور اس میں بھی کسی غزل کا ایک شعر کسی کے دو شعر، کہیں مطلع ندارد، کہیں مقطع غائب۔ پھر بعض اشعار مہمل اور اغلاط کثیر، زبان اکثر اشعار کی ایسی ہے کہ نہ جس کو اردو کہا جا سکتا ہے نہ فارسی۔ ان عیوب کی پردہ پوشی کے لیے ان کے مداحوں نے یہ بات بتائی ہے کہ مرزا کو اردو اور اس کی شاعری سے دلچسپی نہ تھی۔''

غالب کی شاعری کا لسانی عروضی پوسٹ مارٹم وہی شخص کر سکتا ہے جسے اردو شعریات سے مکمل آگہی ہو۔ زبان و بیان، بلاغت و عروض پر مکمل عبور ہو۔ غالب کے اغلاط کی نشان دہی کے لیے صرف وسیع مطالعہ ہی درکار نہیں بلکہ مختلف ادبیات کی لفظیات اور محاورات سے آگہی بھی ضروری ہے۔ عبدالصمد صارم ازہری صرف اردو فارسی نہیں بلکہ عربی کے بھی جید فاضل تھے اور مختلف ادبیات اور لسانیات پر ان کی گہری نظر تھی۔ اردو کے ممتاز ناقد ڈاکٹر محمد علی صدیقی (پاکستان) نے بھی اعتراف کیا ہے کہ ''صارم ہی غالباً وہ واحد نقاد غالب ہیں جنہوں نے عربی اور فارسی زبانوں پر پوری طرح عبور کے ساتھ غالب پر ہمدردانہ طریقے سے اعتراضات کیے ہیں۔''

عبدالصمد صارم ازہری نہایت ذہین و فطین ناقد تھے۔ غالب کے تئیں ان کا رویہ منفی تھا تو مصحفی کے تئیں مثبت۔ انہوں نے مصحفی پر نہایت اہم تنقیدی کتاب بھی لکھی ہے جس کا نام ہے ''اردو کا سب سے بڑا شاعر، مصحفی'' اس کتاب سے ان کی تنقیدی درایت اور ذہنی دراکی کا پتہ چلتا ہے۔

بطور غالب شناس مولانا نورالحسن راشد کا نام بھی اہم ہے کہ انہوں نے غالب اور ان کے معاصرین کے حوالے سے نہایت وقیع مضامین تحریر کیے ہیں اور بعض نئی تحقیقات پیش کی ہیں۔ غالب نامہ دہلی اور آج کل نئی دہلی میں ان کے مقالات شائع ہوتے رہے ہیں۔ غالب کا منظومہ ان کا ایسا ہی تحقیقی مضمون ہے جو آج کل نئی دہلی میں شائع ہوا۔ غالبیات کے ذیل میں ان کے بعض

مضامین اکتشافی اور انکشافی حیثیت کے حامل ہیں۔

غالبیات کی نئی جہات کی جستجو کے حوالے سے مشتاق احمد تجاروی کے بعض مضامین اتنے اہم ہیں کہ ناقدین غالب اور ممتاز غالب شناسوں نے بھی ان کی تحقیقی دریافت کی تحسین وستائش کی ہے۔ پروفیسر نذیر احمد، نثار احمد فاروقی، حنیف نقوی، جیسے ماہرین غالبیات نے مشتاق تجاروی کے تحقیقی مضامین کے نہ صرف حوالے دیے بلکہ ان مضامین کی اطلاعی معنویت اور انکشافی حیثیت کا بھی اعتراف کیا۔ غالب کے معاصرین کے تعلق سے ان کے مضامین نے غالب شناسی کی نئی طرفیں کھولی ہیں اور نئی جہتوں کو روشن کیا ہے۔ ان کے بیشتر مضامین غالب نامہ، دہلی میں شائع ہوئے۔ غالب کے تین اہم معاصر، آغا مرزا: غالب کا ایک شناسا خطاط، بدرالدین علی خاں مہر کن، راؤ رابہ سنگھ، منشی امین اللہ خاں، مولوی نجف علی خاں، مرزا غالب اور نواب حامد علی خاں، مرزا غالب اور مرزا اسفند یار بیگ، تفضل حسین کوکب (غالب کے ایک شاگرد)، مرزا غالب کا فارسی خط، شاگرد غالب رشکی اور ان کا کلام وغیرہ غالب اور متعلقات غالب کے حوالے سے لکھے گئے نہایت اہم اور قیمتی مضامین ہیں جو ماہرین غالبیات کے ''دیدۂ حیراں'' کو وا کرنے کے لیے کافی ہیں۔

غالب فہمی کے تعلق سے ایک اہم کام ممتاز شاعر مولانا ناطق گلاؤٹھی نے بھی انجام دیا ہے۔ انہوں نے ''کنز المطالب'' کے عنوان سے کلام غالب کی شرح لکھی ہے۔ ان کا تشریحی طریقہ کار غالب کے دیگر شارحین سے مختلف تھا۔ انہوں نے جس طرح معنی مرکوز تشریح کی ہے اس سے ان کی تنقیدی بصیرت اور شعر فہمی کے ساتھ زبان و بیان پر مکمل عبور کا بھی پتہ چلتا ہے۔ متن کی قرأت اور ممکنہ مفاہیم ومعانی کی جستجو کوئی آسان کام نہیں۔ مولانا ناطق گلاؤٹھی نے متن غالب کی تعبیر و تفہیم میں یقیناً الگ انداز اپنایا ہے اور یہ بھی شاید دیوبند کا ہی فیض ہے کہ وہاں متن کی تشریح و تفہیم کی روایت نہایت قدیم ہے اور متن کی تشریح و تجزیے کا طریق کار بھی مختلف ہے۔ دیوبند کا تشریحی طریقہ کار ان شارحین سے مختلف ہے جو ایک یا دو زبانوں سے آگہی رکھتے ہیں اور نحویات اور صرفیات سے بے خبر ہوتے ہیں۔ مشتقات پر جن کی نظر نہیں ہوتی اور نہ ہی کشف الفاظ کے تئیں ان کا علم گہرا ہوتا ہے۔ ارباب دیوبند کئی ادبیات سے آگہی رکھتے ہیں اور الفاظ کے اسرار سے بھی آگاہ ہیں اس لیے ان کی تشریح عام شارحین سے مختلف ہوتی ہے۔

ادبی تنقید کے منظرنامے پر فضلاء دیوبند کے ناموں کی جستجو کی جائے تو دو چار نام ضرور ابھریں گے۔ مثلاً علامہ تاجور نجیب آبادی، عبدالصمد صارم ازہری اور ناطق گلاؤٹھی مگر معاصر تنقیدی افق پر

ایک نام بہت نمایاں ہے اور وہ ہے ابوالکلام قاسمی۔ جنہوں نے اردو تنقید کو اس کی اساس سے آشنا کیا اور مشرقی شعریات سے اردو تنقید کو نئی وسعتوں سے ہمکنار کیا۔ قاسمی کا تنقیدی طریقہ کار ان نقادوں سے مختلف ہے جن کے پاس صرف مغربی دانش ہے۔ ابوالکلام قاسمی کا امتیاز یہ ہے کہ انہیں مشرق ومغرب کی ادبی تنقیدی روایت اور رویئے سے نہ صرف آگہی ہے بلکہ ان کی اطلاقی صورتوں کا بھی عرفان ہے۔ ان کی تنقید میں جو تابش، تابندگی وسعت اور ہمہ گیری ہے وہ ان دونوں روایتوں سے کسب فیض اور امتزاج کا نتیجہ ہے۔

''مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت'' ایک اساسی اور حوالہ جاتی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے جو بقول گوپی چند نارنگ ''زندہ رہنے والی کتاب ہے''— ''تخلیقی تجربہ'' اور ''شاعری کی تنقید'' ان کے مختلف تنقیدی طریقہ کار کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔

قاسمی نے متن کی تفہیم کا جو زاویہ اختیار کیا ہے وہ ان کا خود کا وضع کردہ ہے۔ وہ تنقید میں تقلید یا تتبع کے بجائے تفحص اور تجسس کو ترجیح دیتے ہیں اور اسی تجسس نے ان کی تنقید کو تازگی طرفگی کے ساتھ اعتبار اور وقار بھی عطا کیا ہے۔

✪✪✪

۲

دارالعلوم دیوبند — صحافتی سیاق وسباق

صحافت اور سامراجیت

اردو صحافت کے تعمیری، انقلابی مزاج کی تشکیل میں ان علماء کا کردار نمایاں نظر آتا ہے جو جدوجہد آزادی کے درمیان اخبارات ورسائل سے وابستہ تھے۔ زیادہ تر اردو اخبارات کے مدیران کا تعلق مذہبی طبقے سے تھا جنہوں نے صحافت کے ذریعے استعماری عزائم کے خلاف مزاحمتی تحریکیں شروع کیں۔

قلم کی قوت سے آگاہ علماء نے قلم کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا اور سامراجیت کے خلاف تحریری شعلہ فشانی شروع کردی جس کی چنگاری ہندوستان کے چپے چپے میں پہنچی۔

فضلاء دیوبند نے برطانوی سامراجیت کے خلاف باضابطہ صحافتی جنگ کا آغاز کیا اور صرف

ہندوستان کی سرزمین پر نہیں بلکہ چین اور دیگر ممالک میں بھی استعماریت کے خلاف تیغ و تفنگ صحافت کا استعمال کیا۔ پاکستان کے ممتاز انگریزی صحافی ضمیر نیازی نے اردو اور چینی دونوں زبانوں میں شائع ہونے والے ماہنامہ ''العین'' کے حوالے سے لکھا ہے:

''مولانا محمود الحسن اسیر مالٹا کی ہدایت پر ان کے دو شاگرد مولانا مقبول الرحمٰن سرحدی اور شوکت علی بنگالی (بی۔اے) ہجرت کر کے چین چلے گئے تھے اور ۱۹۰۵ء میں شنگھائی میں سیرت کمیٹی کے تحت سرگرمیاں شروع کر دی تھیں۔ وہاں سے انہوں نے اردو اور چینی زبان میں ماہنامہ 'العین' جاری کیا جو ۱۹۰۹ء تک شائع ہوتا رہا۔ وہ مولانا محمود الحسن کی ہدایت پر رسالہ بند کر کے برما چلے گئے تھے۔''

(صحافت پابند سلاسل، ضمیر نیازی، ص: ۳۳۸)

ہندوستان کی تحریک آزادی میں مولانا مظہر الدین شیرکوٹی کے 'الامان' اور 'وحدت' نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ گو وہ مسلم لیگی نظریات کے حامل تھے مگر ان کا اخبار 'الامان' اپنے وقت کا نہایت مقبول، معتبر اور مشہور جریدہ تھا۔ مظہر الدین شیرکوٹی ان صحافیوں میں سے ہیں جنہوں نے صحافت کی وجہ سے جام شہادت نوش کیا۔ انہیں 'الامان' کے دفتر میں ہی قتل کر دیا گیا۔ مدینہ بجنور سے بھی ان کی ادارتی وابستگی رہی جس نے تحریک آزادی میں اہم رول ادا کیا تھا۔

اسی طرح مولانا شائق احمد عثمانی کے اخبار 'عصر جدید' کلکتہ نے بھی آزادی کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا اور اسی اخبار کی وجہ سے تعزیرات ہند کی دفعہ ۵۰۵ کے تحت انہیں ایک سال کی قید بامشقت بھی ملی۔ خلافت تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والے شائق احمد عثمانی جن کا تعلق پورینی بھاگلپور سے تھا اور جو مولانا سید محمد علی مونگیری کے قائم کردہ خانقاہ رحمانی مونگیر کے ترجمان مجلّہ کے مدیر بھی رہ چکے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں کلکتہ سے کراچی چلے گئے جہاں سے انہوں نے 'عصر جدید' کا احیاء کیا۔ عصر جدید کا شمار آزادی وطن کی تحریک میں اہم کردار عطا کرنے والے اخبارات میں ہوتا ہے۔

ان کے علاوہ بھی بہت سے ایسے اخبارات سے فضلاء دیوبند کی وابستگی رہی، جن کا تحریک آزادی میں انقلابی کردار رہا ہے۔

دیوبند کی صحافتی فعالیت

دیوبند کے فضلاء/ علماء نے صحافت سے اپنا رشتہ ہمیشہ استوار رکھا، اسلامیات کے ساتھ ساتھ عصری مسائل، سیاسی، سماجی، ثقافتی، تاریخی موضوعات پر خامہ فرسائی کرتے رہے کیونکہ نئے اسلام

شناسوں کا ایک ایسا کارواں تیار ہوگیا تھا جسے اسلام کی اساس سے آگہی نہیں تھی۔ وہ دین اسلام کی تعبیر وتفہیم اس طور پہ کرنے لگے کہ اسلام کا مفہوم و مدعا اور مقصود و مطلوب ہی بدل گیا—اسلام کو ایک عفریت مہیب کے طور پر پیش کرنے لگے۔ اس لئے ان کے مظنونات، مفروضات کی تردید و تغلیط بھی ضروری تھی چنانچہ علماء نے اپنے منصبی فرائض کی ادائیگی میں کوئی تساہل نہیں برتا اور صحافتی محاذ پر احقاقِ حق، ابطالِ باطل کا فرض ادا کیا۔

دارالعلوم دیوبند سے مجلّہ ''القاسم'' اور ''الرشید'' کے اجراء کا مقصد بھی شاید یہی تھا کہ عوام الناس کو اسلام کے مکمل نظام سے روشناس کیا جائے۔

بابری مسجد کے انہدام، سانحۂ گجرات اور ۹/۱۱ کے حادثات نے صورتِ حال یکسر تبدیل کردی۔ صحافت کے میدانِ کارزار میں اپنے علمی ہتھیار کے ساتھ علماء بے خطر کود پڑے۔ ان عالمی سانحات نے علماء کی تقلیبِ فکر ونظر میں نمایاں رول ادا کیا اور بین الاقوامی موضوعات و مسائل پر انہوں نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ لکھنا شروع کیا۔

موجودہ دور میں مدارس بالخصوص دیوبند سے وابستہ علماء اور فضلاء کی جو تحریریں شائع ہو رہی ہیں، وہ سماجیات، اسلامیات اور اخلاقیات تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ عصری سیاسی موضوعات پر متوازن تجزیے لکھنے والوں کی تعداد بھی خاصی ہے۔ ان کے مضامین سے عالمی احوال وحوادث پر گہری نظر کے ساتھ ساتھ سیاست کے اسرار و رموز اور پس واقعہ سے ان کی مکمل آگہی کا اندازہ ہوتا ہے۔

علماء کے بارے میں عمومی تصور یہ ہے کہ عالمی حالات و واقعات سے بے خبر، ذکر وفکر صبح گاہی میں مستغرق رہتے ہیں مگر اردو اخبارات کے صفحات پر معاصر سیاسی موضوعات و مسائل پر جتنی وقیع متوازن اور مثبت تحریریں علماء بالخصوص دیوبند کے فضلاء کی شائع ہو رہی ہیں۔ وہ اس خیال کی تغلیط کے لیے کافی ہے۔ یہ خوش آئند بات ہے کہ قومی اور بین الاقوامی مسائل وموضوعات پر دیوبند کے فضلاء کی گرفت مضبوط ہے۔ ان کی تحریروں میں سیاسی ژرف بینی، دانش ورانہ بصیرت اور امعانِ نظر روشن ہے۔ جب کہ دیوبند کے بیشتر لکھنے والے ابلاغیات کے جدید ترین اصول وضوابط اور آداب سے بھی نا آشنا ہیں۔ اس کے باوجود ماضی کی وراثت، عصری سیاست و ثقافت پر فضلائے دیوبند کے جو مضامین شائع ہو رہے ہیں ان سے ان کی علمیت، عصری بصیرت، آگہی کے ساتھ ترسیلی مہارت بھی مترشح ہے۔

اس عہدِ زوال میں جب کہ اردو صحافت مائل بہ انحطاط ہے، فکری اور لسانی دونوں اعتبار سے

صحافت کی زبوں حالی اظہر من الشمس ہے جہاں اخبارات میں مضمون، مثلہ، اور تحریر اقلیدس کا خیالی نقطہ بن جاتی ہے اور املا اہمال اور ایسا غوجی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ وہاں زبان و بیان کے ساتھ فکری صحت، نظری استقامت اور ذہنی صلابت کے ساتھ لکھنے والے فضلاء دیوبند کا دم غنیمت ہے جن کی وجہ سے کم از کم صحافتی زبان مجروح نہیں ہوتی اور نہ ہی زبان کی ساخت میں کسی قسم کی شکستگی پیدا ہوتی ہے بلکہ جملوں کا در و بست درست ہوتا ہے۔

یہ بات بھی باعث فخر و ناز ہے کہ ان تحریروں کی وجہ سے اردو زبان و صحافت کی آبرو بچی ہوئی ہے ورنہ زمانہ قدیم سے ہی اردو زبان کی تباہی و بربادی کا جو سلسلہ چل پڑا تھا وہ ہنوز جاری و ساری ہے۔ علامہ شبلی نعمانی نے ایک مشہور صاحب قلم اور اہل الرائے کے حوالے سے لکھا ہے اور ان کے خاص الفاظ بھی درج کئے ہیں:

> ''آج کل میں دیکھتا ہوں کہ اردو کے اخبار، رسالے جو انگریزی پڑھے ہوئے مضامین نگار لوگ نکال رہے ہیں یا اخباروں وغیرہ میں مضامین لکھتے ہیں ان غریبوں کے ہاتھ سے بیچاری اردو کی ایسی مٹی خراب ہونی شروع ہوئی ہے کہ توبہ! مضامین کا عمدہ ہونا دوسری بات ہے مگر زبان یعنی الفاظ اور املا کی غلطیاں ایسی ہوتی ہیں کہ اکثر ان کے پڑھنے تک سے دل نفرت کرتا ہے۔ یہ حالت خود انہیں کے لیے قابل افسوس نہیں ہے بلکہ ایسی غلط عبارتوں اور لفظوں کے شیوع سے آئندہ بہت برے نتائج پیدا ہوں گے۔''

یقیناً آج کی اردو صحافت وہ تمام برے نتائج دیکھ رہی ہے۔ آج کی صحافتی زبان نہایت غلط اور بے معنی ہوگئی ہے اور زبان سنوارنے کے بجائے زبان بگاڑنے کا کام کر رہی ہے۔ صحافتی زبان کے زوال اور ایسی تشویش ناک صورتِ حال میں صحتِ الفاظ اور املا کے اعتبار سے بھی فضلاء دیوبند کی تحریروں کے اعتبار و امتیاز کی نشان دہی کی جا سکتی ہے۔

اردو صحافت کو لسانی اور فکری اعتبار سے ثروت مند بنانے میں فضلاء دیوبند کی تحریروں کے کردار سے انکار ممکن نہیں اور اس فعالیت کی شناخت اور ستائش بہر طور ہونی چاہئے۔

حالیہ دنوں میں مسلم دنیا کے خلاف مغربی میڈیا کے منفی پروپیگنڈے کی وجہ سے بھی دیوبند کے صاحب نظر تجزیہ نگاروں کی معتبریت مضبوط ہوئی ہے۔ انہیں نہ صرف مشرق وسطی کی سیاسی، جغرافیائی، سماجی، ثقافتی صورتِ حال کا مکمل عرفان ہے بلکہ وہ وہاں کی بدلتی صورتِ حال اور عرب عوام کے افکار و احساسات سے بھی براہ راست آگاہ ہیں۔ انہیں عربی اخبارات کے ذریعے عوامی

احساسات اور جذبات کی پوری کیفیت کا ادراک ہوجاتا ہے۔ جب کہ اردو میں مشرق وسطیٰ کے مسائل اور موضوعات پر لکھنے والوں کا بیشتر انحصار مغربی ذرائع ابلاغ اور ان کے متعصبانہ تجزیوں پر ہوتا ہے۔ اس لیے صحیح صورت حال واضح نہیں ہو پاتی۔

مسلم دنیا کے تعلق سے جو مثبت اور عمدہ تجزیئے فضلاء دیوبند نے لکھے ہیں وہ عالم اسلام پر لکھنے والے نام نہاد سیاسی مبصروں اور تجزیہ نگاروں کے مضحکہ خیز مضامین کے مقابلے میں زیادہ معنی خیز، فکر انگیز اور مبنی برحقائق ہوتے ہیں۔ اس تعلق سے مولانا نور عالم خلیل الامینی کا ذکر بطور خاص کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے مشرق وسطیٰ اور مسلم دنیا کے مسائل پر جو سیاسی تجزیئے تحریر کیے ہیں، وہ طرز احساس اور اظہار کے اعتبار سے منفرد اور ممتاز ہیں۔ ان کے تجزیئے عمدہ اور مبنی برحقیقت ہوتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں حقائق کی عکاسی ہی نہیں بلکہ امت اسلامیہ کے لیے بیداری کا پیغام بھی ہوتا ہے۔ ان کی تحریریں ذہن کو جھنجھوڑتی ہیں اور ضمیر کو بیدار بھی کرتی ہیں۔ ایک مضمون میں لکھتے ہیں ''نظریاتی یلغار عسکری یورش سے زیادہ دوررس دیرپا اور طاقت ور ہے۔ اس لیے ماضی میں یہ ہوا کہ اسلام دشمن طاقتیں اکثر اوقات میں فکری یلغار کو کام میں لاکر عسکری یورش سے مکمل طور پر بے نیاز ہوگئیں۔'' اسی طرح انہوں نے اپنے ایک مضمون میں بہت پتے کی بات لکھی ہے ''نیا امریکی سامراج عصر حاضر میں نئی انفارمیشن ٹیکنالوجی اور نئے ذرائع ابلاغ کے سارے جدید ترقی یافتہ طریقہ ہائے کار کو استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ تمام روایتی طریقہ ہائے کار سے بھی بخوبی فائدہ اٹھا رہا ہے تاکہ وہ نظریاتی یلغار کو نئی طاقت فراہم کرسکے اور پہلے سے زیادہ موثر انداز میں عالم اسلام کو سرنگوں کرسکے۔''

فضلاء دیوبند کے صحافتی امتیازات کی نشان دہی یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ یہاں کے فضلاء اپنی صحافتی تحریروں کے ذریعے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کی ادائیگی کے ساتھ ثقہ اور غیر ثقہ خبروں کے درمیان تفریق بھی کرتے ہیں، عدل واعتدال اور حزم واحتیاط کے پہلو کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ ان کی صحافت افادی اور عوام اساس ہوتی ہے۔ اس لیے کوشش ہوتی ہے کہ جذباتی مغالطہ آمیزی، ہمز ولمز یا مفروضات کے بجائے معروضی حقائق پر ارتکاز ہو اور تمام معاملات میں قرآنی احکامات اور اشارات کو ملحوظ رکھا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ منفی پروپیگنڈے کے بجائے نہایت مثبت اور تعمیری انداز کے مضامین لکھتے ہیں۔ عصری سیاست، عالمی واقعات وحالات پر لکھتے ہوئے بھی یہی طریقہ کار اختیار کرتے ہیں۔ گوکہ بعض فضلاء کی تحریروں میں جذباتی شدت پسندی اور مذہبی نرگسیت بھی ہوتی ہے مگر زیادہ تر لکھنے والے صحافت کے ان زریں اور اساسی اصولوں کا احترام

کرتے ہیں جو معتبر اور ثقہ صحافت کے لئے ناگزیر ہیں۔

دیو بند کے فضلاء نے صحافت کے ذریعے اعلاء کلمہ حق کا فریضہ بھی انجام دیا ہے۔ سیاسی جبریت اور سماجی مسلکی ادعائیت کے خلاف ان کا قلم تیغ براں بن جاتا ہے اور خطیبانہ آہنگ کے ساتھ رجزیہ انداز شروع ہوجاتا ہے۔ جھوٹ اور سچ کے درمیان امتیاز بھی دیو بند کی صحافتی شناخت کو استحکام عطا کرتا ہے۔ فضلاء دیو بند نے قول معروف اور قول بلیغ کو ہی اپنا صحافتی طریقہ اظہار بنایا ہے اور اسی کے ذریعے وہ دعوت و موعظت کا کام بھی کررہے ہیں۔ ارباب دیو بند کی تحریروں میں اعتدال اور توازن ہوتا ہے۔ قولِ زور اور مبالغہ آرائی، افراط و تفریط سے اجتناب کا جو طریقہ کار قرآن و حدیث نے بتایا ہے اس پر سختی سے عامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عصری صحافت میں دیو بند کا کردار نہایت صاف شفاف اور سلجھا ہوا ہے۔

اردو کے صحافتی منظر نامہ میں بہت سارنگ و نور فضلاء دیو بند کا بھی ہے اور منظر نامہ کو نیا نقش عطا کرنے میں بھی ان کا حصہ کسی سے کم نہیں ہے۔ جن رسالوں اور صحافیوں نے صحافت کو نئے آفاق عطا کئے، صحافتی شان و شوکت میں اضافہ کیا اور معاشرے پر صحت مند اور مثبت اثرات ڈالے، ان میں مولانا سید ممتاز علی (تہذیب نسواں، لاہور)، علامہ تاجور نجیب آبادی (مخزن، ادبی دنیا، شاہکار، لاہور)، مولانا مظہر الدین شیرکوٹی (الامان، دہلی)، مولانا مناظر احسن گیلانی، (القاسم، دیو بند)، مولانا سعید احمد اکبرآبادی (بُرہان، دہلی)، مولانا شائق احمد عثمانی (روزنامہ عصر جدید، کلکتہ)، مولانا عبدالوحید صدیقی (ہفت روزہ نئی دنیا دہلی)، مولانا عامر عثمانی (تجلی، دیو بند) حامد الانصاری غازی، (مدینہ بجنور، جمہوریت، ممبئی)، مولانا منظور نعمانی (الفرقان، لکھنؤ)، قاضی زین العابدین (الحرم، میرٹھ)، مولانا رضوان القاسمی (صفا، حیدرآباد)، احمد مصطفےٰ راہی (پُکار، نئی دہلی)، محمد یوسف شاہ کشمیری میر واعظ (سہ روزہ اسلام، رہنما کشمیر) کے نام قابل ذکر ہیں۔

کچھ ایسے بھی مجلات ہیں جن کا ارتکاز ادبیات اور ادبی سماجیات پر رہا ہے۔ ان میں ابوالکلام قاسمی کے 'انکار' (علی گڑھ) اور اعجاز عرفی کے 'وقار' (بردوان) کا نام نمایاں ہے۔

پاکستانی صحافت میں بھی دیو بند کے فضلاء نے اپنے نمایاں نقوش مرتسم کئے ہیں۔ ان میں مولانا محمد تقی عثمانی (البلاغ، کراچی)، مولانا سمیع الحق (الحق اکوڑہ، خٹک)، مولانا یوسف بنوری (بینات، کراچی)، مولانا فاضل حبیب اللہ رشیدی (الرشید، ساہیوال)، مولانا اشرف علی (صدائے اسلام، پشاور)، مولانا عبدالجلیل (تمدن، ڈیرا اسمٰعیل خاں)، غلام غوث ہزاروی (ترجمانِ اسلام، لاہور)، سید بادشاہ گل (الجامعہ، اکوڑہ خٹک)، مفتی سیاح الدین، (شمس الاسلام، بھیرا) بہاء الحق

قاسمی (الارشاد، امرتسر و لاہور)، مفتی محمد حسن امرتسری (انوارالعلوم، لاہور)، مطیع الحق قاسمی (ضیاء العلوم، لاہور)، کے نام قابل ذکر ہیں۔

ان کے علاوہ مدارس کے مجلات میں حکیم محمد ادریس حبان رحیمی (ماہنامہ نقوش عالم، بنگلور)، مولانا عبدالاحد قاسمی تاراپوری (ماہنامہ صوت القرآن، احمد آباد، گجرات)، آس محمد گلزار قاسمی (ماہنامہ یادگار اسلاف، اجراڑہ، میرٹھ)، عبدالمنان قاسمی ایم اے (نائب مدیر، ماہنامہ اذان بلال، آگرہ)، مفتی محمد میاں قاسمی (ماہنامہ الکاشف، بریلی)، بختیار ثاقب قاسمی (نائب مدیر: الکاشف، بریلی)، محمد رحمت اللہ میر قاسمی (النور، بانڈی پورہ، کشمیر)، مفتی انعام الحق قاسمی (مدیر معاون: انوار الہدی، حیدرآباد)، عبداللہ خالد قاسمی (ماہنامہ مظاہرالعلوم، سہارن پور)، محمد سلمان منصور پوری (ماہنامہ ندائے شاہی، مرادآباد)، محمد ابوالکلام قاسمی (دین مبین، بھوپال)، مولانا عبدالعلی فاروقی (البدر، لکھنؤ) حیات اللہ قاسمی (ماہنامہ نورالعلوم، بہرائچ) ضیاء الحق خیرآبادی (ماہنامہ ضیاء الاسلام، اعظم گڑھ) کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

مولانا محمد رفیع (رسالہ ہندوستان الہ آباد)، مولانا عبداللہ فاروقی (بانی خاتون مشرق، دہلی)، مخمور عثمانی (بشریٰ)، مولانا ابوالخیر دربھنگوی (ماہنامہ شوخ مونگیر، لیچی باگی پور)، سالم جامعی (الجمعیۃ، دہلی)، شاہین جمالی (دیوبند ٹائمز، دیوبند)، سید فضل الرحمٰن قاسمی (ہفت روزہ مسلم گزٹ کٹک)، مولانا سید احمد ہاشمی (ہفت روزہ، ارمغان اور سچ بات)، ابوالکلام قاسمی (الفاظ، علی گڑھ)، ہاشم القاسمی (الفیصل، حیدرآباد)، احمد علی قاسمی (دعوت و عزیمت، دہلی)، مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی (السلام، مالیرکوٹلہ)، حبیب الرحمٰن اعظمی (القاسم، دارالعلوم دیوبند)، قاضی زاہد الحسینی (پیام اسلام لکھنؤ ہفت روزہ اذان، کیملپور، الارشاد، کیملپور)، صادق علی قاسمی (نقوش حیات، سنت کبیر نگر)، مولانا محمد اسرار الحق قاسمی (ملی اتحاد، نئی دہلی)، سید احمد خضر شاہ (محدث عصر، دیوبند)، ڈاکٹر مختار احمد قاسمی علیگ (مدیر معاون: ماہنامہ کردار جمعیۃ، نئی دہلی)، ڈاکٹر منصور قاسمی (طب و سائنس، دیوبند)، محمد عمران قاسمی (الشفاء بالاساتھ، سیتامڑھی)، اشرف سعودی، (سلسبیل، بنگلور)، عابد انور (صفا ٹائمس، نئی دہلی)، عمر فاروق قاسمی (سہ ماہی بصیرت، مدھوبنی)، ندیم الواجدی (ترجمان دیوبند)، شعیب اختر جلیل القاسمی (معاون مدیر: ماہنامہ تحفہ خواتین، مرادآباد) کے نام صحافت کی تاریخ میں قابل ذکر ہیں۔

افق صحافت کے درخشاں ستارے

مولانا سید ممتاز علی

اردو کی مجلاتی صحافت میں شمس العلماء مولانا سید ممتاز علی (۱۸۶۰-۱۹۳۵ء) کا نام اس اعتبار سے بھی تابناک ہے کہ انہوں نے ایک ایسے وقت میں "تہذیب نسواں" کے نام سے عورتوں کا اخبار جاری کیا جب عورتوں کے لیے چاک قفس سے باغ کی دیوار دیکھنا بھی ممنوع تھا۔ انہوں نے 'تہذیب نسواں' نہ صرف جاری کیا بلکہ خواتین قلم کاروں کی ایک بڑی تعداد اسی 'تہذیب نسواں' کی مرہون منت ہے۔ آج جتنی بھی تعلیم یافتہ، مہذب اور شعر و ادب کی دنیا میں معروف و مشہور خواتین ہیں، سب کا سلسلہ 'تہذیب نسواں' سے ہی جڑا ہوا ہے۔ اس رسالے نے اس 'طبقہ نسواں' کو وہ تحریری پلیٹ فارم مہیا کیا جن کے خط و کتابت پر بھی پابندی عائد تھی۔ ایسے مرد حاوی معاشرہ میں خواتین کی ذہنی اور تحریری تربیت کے لیے بلا خوف لومۃ لائم مولانا نے 'تہذیب نسواں' جاری کیا اور اس رسالے کے ذریعہ عورتوں میں تعلیم و تربیت کی روشنی پھیلی۔ مولانا غلام رسول مہر نے اپنے اداریہ میں مولانا ممتاز علی کی خدمات کو سراہتے ہوئے لکھا ہے:

> "پشاور سے کنیا کماری تک جتنے مسلمان خاندانوں کی عورتیں اور لڑکیاں معمولی شد بد رکھتی ہیں یا اعلیٰ تعلیم پا چکی ہیں یا پا رہی ہیں۔ وہ سب بلا مبالغہ، شمس العلماء مولانا سید ممتاز علی کے شرمندہ احسان ہیں جنہوں نے اپنی ساری عمر تعلیم و تہذیب نسواں کی نذر کردی پابندی وضع کا پایہ اس قدر بلند — وہ اس محدود دائرہ عمل سے نکل کر قوم کی سیاسی و مذہبی رہ نمائی کرتے تو ملک کے بہترین رہبروں کی صف اول میں ہوتے لیکن قوم کے نصف بہتر کی تعلیم و تہذیب مدت دراز تک معرض التوا میں پڑ جاتی کیونکہ اس دائرے میں بھی مولانا کا نعم البدل دستیاب ہونا بے حد دشوار تھا۔"

'تہذیب نسواں لاہور' کے نہایت فعال اور متحرک ادبی کردار کے حوالے سے ڈاکٹر انور سدید نے لکھا ہے:

> "پنجاب میں تعلیم و بہبودی نسواں کی تحریک کو جن لوگوں نے فروغ دیا ان میں سید ممتاز علی کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ انہوں نے 'تہذیب نسواں' کے نام سے ایک ہفتہ وار رسالہ یکم جولائی ۱۸۹۸ء کو اپنے ادارہ دارالاشاعت لاہور سے جاری کیا اور اس میں

عورتوں کے سماجی، تہذیبی، مذہبی اور فکری مسائل کو زیر بحث لانے کا سلسلہ وسیع پیمانے پر شروع کر دیا۔ سید ممتاز علی کا مقصد خواتین کو صرف امور خانہ داری سے آشنا کرنا نہیں تھا، انہوں نے عورت کی ادبی صلاحیتوں کو بیدار کیا اور اپنے مسائل کو خود اپنی نظر سے دیکھنے کا ادراک عطا کیا۔ ان کی اس قسم کی مساعی کو سید احمد خاں، مولانا حالی اور نذیر احمد دہلوی کے علمی، فکری اور اصلاحی کاوشوں کا منطقی نتیجہ قرار دیا گیا ہے— تہذیب نسواں، ۱۹۴۹ء تک باقاعدگی سے چھپتا رہا۔ اس کے حلقہ ادارت میں مولانا عبدالمجید سالک، امتیاز علی تاج اور احمد ندیم قاسمی جیسے ممتاز ادباء شامل رہ چکے ہیں۔ 'تہذیب نسواں' کو ایک ایسے ادبی پرچے کی حیثیت حاصل ہے جسے مرد ادباء مرتب کرتے تھے لیکن جس کی حیثیت بہبودی نسواں کی تھی۔ اس نے عورتوں کی ذہنی بیداری، شعور کی پختگی، تعلیم میں پیش قدمی اور مسائل حیات میں براہ راست شرکت کے رجحانات کو تقویت دی، تہذیب نسواں کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہ نصف صدی تک عورتوں کے حقوق کی نگہداشت کرتا رہا اور ہر پڑھے لکھے گھرانے میں خواتین کے ذوق مطالعہ کا جز و لاینفک بن گیا۔ 'تہذیب نسواں' نے خواتین کے قلم کو خصوصی اعتماد عطا کیا اور ثابت کر دیا کہ اعلیٰ درجے کی انشا پردازی صرف مردوں کا خاصہ نہیں بلکہ اس میں خواتین بھی اپنا تخلیقی کردار خاطر خواہ طور پر سرانجام دے سکتی ہیں۔ ''تہذیب نسواں'' اس دور میں نئے لکھنے والی خواتین کے لے رہنما ثابت ہوا۔ اس رسالے نے ان کی تخلیقی سرگرمیوں کے لیے پہلی سیڑھی کا کام دیا۔ اس کے صفحات سے نذر سجاد حیدر، محمدی بیگم، حجاب امتیاز علی، زبیدہ زریں، جمیلہ بیگم، سنجیدہ اشرف علی، سلطانہ آصف فیضی، صغرا ہمایوں جیسے متعدد نئے نام ابھرے۔''

(خواتین کے لئے رسائل، مطبوعہ: شاعر، ممبئی، جون ۲۰۰۳ء)

مولانا نے ''مشیر مادر'' نام کا ایک رسالہ بھی ۱۹۰۵ء میں شائع کیا اور پھر بچوں کا اخبار 'پھول' جاری کیا— بچوں کے اخبار کا اس سے پہلے کوئی تصور نہ تھا—

مولانا کی صحافتی خدمات کا دائرہ نہایت وسیع ہے مگر المیہ یہ ہے کہ مشہور ڈرامہ ''انار کلی'' کے مصنف امتیاز علی تاج اور مشہور رومانی افسانہ نگار حجاب امتیاز علی سے پوری ادبی دنیا واقف ہے مگر امتیاز علی تاج کے والد ماجد مولانا سید ممتاز علی اور حجاب کے قبلہ محترم سے اردو دنیا کا ایک بڑا طبقہ ناآشنا ہے۔

مولانا مظہرالدین شیرکوٹی

مظہرالدین شیرکوٹی کے آئینہ ادراک میں ملک اور ملت کے مستقبل کا نقشہ واضح تھا اور مذہبی اقلیتوں کی اذیتوں کا احساس اور درد بھی نمایاں تھا۔ اس لیے انہوں نے دیوبند کی عمومی سیاسی راہ و روش سے الگ راہ اختیار کی اور تاحین حیات مسلم لیگی نظریات کی تبلیغ کرتے رہے۔ وہ اپنے سیاسی موقف پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہے اور کسی طرح کی مفاہمت نہ کی بلکہ اپنے اصول اور موقف کی وجہ سے جام شہادت نوش کیا۔ مظہرالدین شیرکوٹی، حق گو اور بیباک صحافی تھے۔ صحافت کی خاطر شہید ہونے والے صحافیوں میں ان کا نام بھی روشن ہے۔

ان کی صحافتی زندگی کا آغاز، مولوی مجید حسن کے اخبار ''مدینہ'' بجنور سے ہوا جو کہ کانگریس کا حمایتی اخبار تھا، کچھ عرصہ وہ مولانا ابوالکلام آزاد کے ''البلاغ'' کلکتہ سے بھی وابستہ رہے جیسا کہ رولٹ کمیٹی کی رپورٹ میں ہے مگر ان کی سیاسی فکر میں تبدیلی آئی اور وہ محمد علی جناح کے حامی بن گئے اور ان کی سیاسی بصیرت اور مضبوط طرز استدلال نے انہیں اتنا متاثر کیا کہ اپنے اخبار ''الامان'' اور وحدت'' کو مسلم لیگ کے نظریات کی تبلیغ کے لیے وقف کردیا۔ انہوں نے ہی سب سے پہلے محمد علی جناح کو دلی میں پانچ سو ایک روپے کی تھیلی پیش کی اور ان کا شایان شان استقبال کیا۔

مظہرالدین شیرکوٹی، مقتدر صحافی اور مشہور ناول نگار بھی تھے۔ ان کے کئی ناول اس زمانے میں بہت مشہور ہوئے، ان کی قوت تخیل نہایت بلند تھی اور سیاسی فکر میں بھی اس قوت تخیل کی منطق، کارفرما تھی۔ اسی لیے ان کی سوچ، دیوبند کے ان زعماء سے الگ تھی جو کانگریس کی حمایت کو لازمی سمجھتے تھے۔

مظہرالدین شیرکوٹی کے سامنے ملک کا سیاسی منظرنامہ واضح تھا اور انہیں ادراک تھا کہ مذہبی خطوط پر منجمد، منفی قوتیں متحد نہیں ہوسکتیں اور قومی اتحاد یا ملٹی کلچرزم کا نعرہ محض فریب یا سراب ہے۔ ان کی نظر میں قومی قائدین ''خلق فریبی'' میں مصروف تھے جن کے قلب ونظر کی رنجوری نے مستقبل کی ٹھوس اور جامد حقیقتوں کو منکشف نہیں ہونے دیا۔

مولانا مظہرالدین شیرکوٹی کی صحافتی بصیرت اور سیاسی فراست پر موجودہ سیاسی سماجی بحران نے مہر تصدیق ثبت کردی ہے کہ جس اتحاد کی خاطر علماء نے جنگ لڑی، وہی اتحاد پارہ پارہ ہوگیا اور ملک کی تقسیم سے قبل ہی ذہن مختلف ٹکڑوں میں بٹ گئے۔

مولانا عبدالوحید صدیقی

اردو صحافت کو نئی سمتوں کا شعور دینے والوں میں عبدالوحید صدیقی کا نام یوں بھی نمایاں ہے کہ اذیتوں اور آلام سے گزرنے کے باوجود انہوں نے اذان حق کو موقوف اور معطل نہیں ہونے دیا۔ تلواروں کی چھاؤں میں بھی کلمہ صداقت و عدالت پڑھنے والے عبدالوحید صدیقی کا سب سے بڑا صحافتی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ملک کے اجتماعی ذہن اور ضمیر کو بیدار کیا۔ سہمی اور خوف زدہ مخلوق کے سینے کو جوش، ولولہ وطغیانی سے بھر دیا۔ آواز کے انجماد کو توڑا اور اس آواز کو احتجاج کا وہ رنگ عطا کیا کہ ایوان اقتدار بھی لرز اٹھا۔

مولانا عبدالوحید صدیقی کی حق پسندی، بے خطری، بے باکی، خوئے اسداللٰہی، عنتری اور مرجبی لہجے نے انہیں اردو کے صحافیوں میں ممتاز مقام بھی عطا کیا اور وہ 'اعتبار' بھی جو برسوں کی ریاضت، محنت و مشقت کے بعد بھی نہیں مل پاتا۔ انہوں نے عوامی اذہان کو مسخر اور دلوں کو اس طرح فتح کیا کہ صحافت میں آج بھی مولانا عبدالوحید صدیقی کی حکمرانی قائم ہے۔

عبدالوحید صدیقی میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو ایک ہمہ جہت صحافی کے لیے ضروری ہوتی تھیں۔ ان میں بے پناہ تحمل تھا اور تجمل بھی، وہ حاضر دماغ بھی تھے اور ان کا تخیل بھی بلند تھا۔ ان کے اندر دردمندی بھی تھی اور غیر جانب داری بھی۔ یہی وجہ ہے کہ صحافتی محاذ پر وہ ظفریاب اور کامران رہے۔ انہیں کبھی ہزیمتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا، وہ کسی بھی موڑ پر شکستہ پا نہیں ہوئے، ہرنئی اذیت میں نئی آن و بان اور شان کے ساتھ جلوہ گر ہوئے۔ انہوں نے ہمت ہارنا نہیں سیکھا، وہ لہولہان، زخمی، شکستہ پاؤں سے ہی منزل کی طرف بڑھتے رہے۔ وہ نہ کبھی مضمحل ہوئے اور نہ کم حوصلگی افسردگی کے شکار۔ ان کے بال و پر میں اتنی قوت تھی کہ موج حوادث سے لڑتے رہے مگر حالات سے شکست نہیں کھائی ـــ صحافتی زندگی میں ان پر کتنی قیامتیں گزریں مگر ہر قیامت کی کوکھ سے ایک نئے حوصلے اور عزم نے جنم لیا کہ قیامت کو انگیز کرنے والے وہ واحد صحافی تھے کہ تیز وتند ہوا میں بھی چراغ جلاتے رہے۔ ان کے چراغ کی لو کبھی مدھم نہیں ہوئی۔

مولانا عبدالوحید صدیقی صحیح معنوں میں دشت صحافت کے سیاح تھے اور اسی سیاحی نے جہاں انہیں لاہور کے 'مساوات'، 'زمیندار' اور 'انقلاب' جیسے اخبارات سے وابستہ کیا وہیں 'الجمعیۃ' جیسے اخبار سے بھی ان کا ادارتی تعلق قائم کیا۔ ان کی ذات سے منسوب جہاں ہفت روزہ 'ہمت' ہفت روزہ 'طاقت'، روزنامہ 'واقعات نو' جیسے اخبارات ہیں۔ وہیں ماہنامہ 'ہدف' اور پندرہ روزہ 'واقعات' بھی

ہیں۔ ڈائجسٹ کی دنیا میں قدم رکھا تو 'ہما' اور 'ہدی' جیسے مقبول عام ڈائجسٹ جاری کئے۔ اور یہی نہیں بلکہ ایک ادبی مجلّہ 'جاوید' کے نام سے نکالا۔

مختلف اخبارات سے وابستگی نے جہاں ان کے ذہنی افق کو وسعت دی اور صحافتی تجربوں کو تنوع عطا کیا وہیں معروضی نقطہ نظر بھی میسر ہوا جس کی وجہ سے ان کے سیاسی اور صحافتی تجزیے کو وقار نصیب ہوا اور مخالفین اور معاندین بھی ان کی حق گوئی اور بے باکی کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے اور اس حق گوئی اور بے خطری کا مظہر ان کی صحافتی شناخت کا معتبر حوالہ 'نئی دنیا' اخبار تھا جو ۱۹۵۱ء میں جاری ہوا اور ہنوز اس کا صحافتی سفر جاری و ساری ہے، اس میں کسی قسم کا کوئی تعطل واقع نہیں ہوا۔

'نئی دنیا' کو اردو صحافت میں جو 'سمت نما' کی حیثیت حاصل ہے اس میں بہت کچھ دخل مولانا عبدالوحید صدیقی کی متواتر اور مسلسل ریاضت کا ہے۔ مسلمانوں کے ملی شعور اور سائیکی پر جس اخبار نے سب سے زیادہ گہرے اثرات ڈالے ہیں، اس میں 'نئی دنیا' کا نام سرفہرست ہے کہ اسی اخبار کی وجہ سے مسلمانوں کو اجتماعی آواز ملی اور سیاسی افق پر ان کی حیثیت مستحکم ہوئی۔ اگر 'نئی دنیا' نے بروقت قومی اور ملی ضمیر کو نہ جھنجھوڑا ہوتا تو شاید صورت حال کچھ دوسری ہوتی اور مسلمان، حاشیے پر ہمیشہ کے لیے دھکیل دیئے جاتے۔

'نئی دنیا' نے اپنے پہلے اداریہ ۱۰ر جولائی ۱۹۵۱ء میں ہی صاف صاف لفظوں میں واضح کر دیا تھا کہ:

> ''ہم نے ہندو اور مسلمانوں کی اصطلاحوں میں کبھی گفتگو نہیں کی لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد جو حالات و واقعات پیدا ہوئے انہوں نے ایک بار ہمیں اس حقیقت کا یقین دلایا ہے کہ ہندوستان کی بدلتی ہوئی دنیا میں اگر ہمیں زندہ رہنا ہے تو ہمیں مسلمان اور ہندوستان کی حیثیت سے بھی زندہ رہنے کی کوشش کرنی چاہیے — یہ بات ہم ایک فرقہ پرست یا پاکستانی کی حیثیت سے نہیں کہیں گے کہ فرقہ پرست یا پاکستانی بننا ہمارے مزاج اور فطرت کے بالکل خلاف ہے لیکن ہمیں موجودہ دور کی یہ اہم ترین ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ سیاسی و تمدنی طور پر مسلمان بھی زندہ رہیں اور اب ان کی پوزیشن ایسی ہوگئی ہے کہ واقعات و حقائق اور شمار و اعداد کی روشنی میں گفتگو کرنا ضروری ہے۔''

ایک اور اداریہ میں مجاہد کی اذاں یوں بلند ہوئی:

> ''روزنامہ نئی دنیا کا مقصد حیات یہ اور صرف یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو آزاد ہندوستان میں ہند کے دستور اساسی کے مطابق وہی مقام اور درجہ حاصل ہے جو کسی

دوسرے کو حاصل ہو۔ وہ یہاں پر باعزت اور بے خوف وخطر زندگی بسر کریں گے۔ ان کے ساتھ انصاف کیا جائے۔ ہم کہنا چاہتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کے دلوں میں کسی قسم کے خوف و ہراس نے جگہ لے لی۔ ان میں احساس کمتری پیدا ہوا۔ ان سے ناانصافی کی گئی تو یہ بات انجام کار ہماری نوزائیدہ جمہوریت کے لیے مضرت رساں ہوگی۔ اس لیے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد لگ بھگ ۵ کروڑ ہے اتنی بڑی آبادی کے ساتھ ناانصافی اس پر تشدد اور اس سے غیر جمہوری سلوک نہ تو دانش مندی ہے اور نہ ممکن۔ ہم آزاد ہندوستان کے شہری ہیں۔ ہم کبھی یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ کوئی اٹھے اور جمہوری دور میں مسلمانوں سے راجکماروں کے انداز میں بات کرے اور ان کو دھمکانا شروع کر دے۔ ان کی ہمتوں اور حوصلوں کو پست کر دے۔ اگر کبھی ایسا ہوا تو ہمیں نہ صرف دفاع کرنا پڑے گا بلکہ ہم منہ توڑ جواب دینے سے بھی گریز نہ کریں گے کہ ہم کسی ذلت آمیز سلوک کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔''

'نئی دنیا' نے ہمیشہ اس پالیسی پر عمل کیا ہے اور مظلوم مسلمانوں کے حق میں آوازیں بلند کی ہیں۔ نئی دنیا کا یہی صحافتی امتیاز ہے جس نے مذہبی فسطائیت اور فرقہ پرستی کی تاریکی میں صحافت کی شمع کو نہ صرف روشن رکھا ہے بلکہ مخالف زہریلی ہواؤں سے لڑنے کا حوصلہ بھی بخشا ہے۔

مولانا عبدالوحید صدیقی نے ایک پوری نسل کی صحافتی تربیت کی اور ان کے اندر سیاسی شعور بیدار کیا۔ آج اردو میں جتنے بھی معتبر اور مستند صحافی ہیں، بیش تر نئی دنیا کے ہی فیض یافتہ ہیں۔

مولانا عبدالوحید صدیقی، ہندوستان کی اردو صحافت کا ایک روشن باب ہیں اور ان کی گراں قدر صحافتی خدمات کا اعتراف ہر طبقہ اور ہر نسل کے لوگوں نے کیا ہے۔ بلاتخصیص مذہب و ملک ہر باشعور، بیدار ذہن نے ان کی جرأت مندی کو سلام کیا ہے۔ ممتاز مزاح نگار مجتبیٰ حسین نے ان کی بلند قامت شخصیت اور بے باک صحافت کو یوں خراج عقیدت پیش کیا ہے:

> ''مولانا عبدالوحید صدیقی ایک اعلیٰ اور بلند پایہ صحافی تو تھے ہی لیکن ان کا رویہ زندگی کے تعلق سے محض ایک صحافی کا نہیں تھا بلکہ ایک دانشور کا تھا۔ ان کے اداریے بڑے جذباتی بھی ہوا کرتے تھے لیکن وہ معقولیت پسندی اور دانشوری کا دامن کبھی اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تھے اور وہ ہندوستانی مسلمانوں کو قومی دھارے میں رکھ کر ان کے مسائل اور مطالبات پر بحث کرتے تھے، انہوں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ مسلمانوں کی ڈیڑھ اینٹ کی علیحدہ مسجد بننی چاہیے۔''

(مولانا عبدالوحید صدیقی، شخصیت اور ادبی خدمات، مرتبہ: پروانہ ردولوی، ماہنامہ کتاب نما، نئی دہلی، مدیر: شاہد علی خاں)

اردو صحافت کے اس غازی اور مجاہد کا تعلق مشرقی اتر پردیش کے شہر غازی پور سے تھا۔ ۱۸۹۷ء میں ان کی پیدائش ہوئی۔ دارالعلوم دیوبند سے نہ صرف تعلیم حاصل کی بلکہ شعبۂ تنظیم و ترقی سے بھی وابستہ رہے۔ ۹/اپریل ۱۹۸۱ء کو یہ آفتاب صحافت ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا مگر وہ نقش چھوڑ گیا ہے کہ زمانے کی تاریخی گردشیں بھی اسے مٹا نہیں پائیں گی۔

مولانا حامد الانصاری غازی

حامد الانصاری غازی ان مقتدر صحافیوں میں سے ہیں جنہوں نے صحافت اور صداقت کے درمیان کسی فاصلے کو گوارا نہیں کیا۔ انہوں نے ہمیشہ استعماریت، سیاسی جبریت، مطلق العنانیت اور آمریت کے خلاف آواز بلند کی۔ ان کی وابستگی ایسے اخبارات سے رہی جو حرف حق بلند کرنے کے لیے شہرت رکھتے ہیں اور جن اخبارات سے جمہور عوام کا نہایت جذباتی اور قلبی رشتہ رہا ہے۔ جن اخبارات نے عوام کی ذہن سازی کی اور ہندوستان کی جنگ آزادی کے لیے قربانیاں دی تھیں۔ الجمعیۃ دہلی، مدینہ بجنور، جمہوریت ممبئی، ایسے ہی اخبارات تھے جن کے روشن کردار سے عوام و خواص دونوں آگاہ ہیں۔

حامد الانصاری کے اندر بے پناہ سیاسی بصیرت اور فراست تھی، انہوں نے اپنے مضامین میں اپنے سیاسی تدبر و تفکر کا ثبوت دیا اور نہایت مربوط، شستہ شائستہ زبان میں عصری واقعات و حالات پر شذرات لکھے۔ ان کی تحریروں میں ان کے سیاسی شعور کی پختگی اور ان کے سیاسی نظریے اور رویے کا استحکام نظر آتا ہے۔ معاصر سیاسی، سماجی نظام پر بھی ان کی گہری نظر تھی اور اسلام کے سیاسی نظام کا بھی گہرا مطالعہ تھا۔ اس لیے انہوں نے معاصر سیاسی نظام پر لکھتے ہوئے اسلام کے سیاسی نظام کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ ان کی سیاسی تحریروں میں جو فکری توازن اور اعتدال ہے، وہ دونوں نظام سے آگہی کا فیضان ہے۔

حامد الانصاری نے صحافتی اخلاقیات اور آداب کا پاس رکھتے ہوئے مضامین لکھے اور کبھی کسی تعصب یا تنگ نظری کے شکار نہیں ہوئے۔ انہوں نے ہمیشہ قومی، ملکی مفادات کو ترجیح دی اور تعمیری اور مثبت انداز اپنایا۔

حامد الانصاری کی سیاسی فکر میں وہ روشنی شامل تھی جو انہیں وراثت میں ملی تھی، ان کا پورا

خانوادہ علمی، مذہبی اور سیاسی فکر کے اعتبار سے ممتاز تھا۔ مولانا قاسم نانوتوی کے نواسے مولانا منصور انصاری بن مولانا عبداللہ انصاری انبیٹھوی جیسے مجاہد آزادی کے فرزند تھے جو شیخ الہند کے مشن میں شامل تھے اور جو مدینہ منورہ کے گورنر غالب پاشا کا خفیہ خط ''غالب نامہ'' لے کر آئے تھے۔ 'مولانا منصور ریشمی خطوط' لکھنے والوں میں سے تھے۔ افغانستان اور روس میں بھی رہے۔ ان کی گہری سیاسی بصیرت اور عرفان کا ثبوت خدمت الٰہی، اساس انقلاب جیسی کتابیں ہیں۔

جلاوطنی کی زندگی گزارنے والے مولانا منصور میاں (م ۱۹۴۶ء) افغانستان کے جلال آباد میں دفن ہوئے مگر ان کے سیاسی مشن کو اپنی تحریروں کے ذریعہ حامد الانصاری نے آگے بڑھایا اور اردو صحافت کا ایک نہایت تابناک نام بن کر ابھرے۔ ایسی گہری سیاسی بصیرت اور آگہی، بہت کم لوگوں کو میسر آتی ہے جو مولانا کو حاصل تھی۔ سچ یہ ہے کہ حامد الانصاری جیسے ذی علم دانشور، صحافی، اردو صحافت کے منظرنامہ پر بہت کم ہیں۔

حامد الانصاری غازی ہندوستانی سیاست کے مدوجزر اور نشیب و فراز سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ ان کے لیے سب سے زیادہ تشویش ناک بات مسلم جماعتوں کا انتشار تھی۔ قوم پرور مسلمانوں کے بکھراؤ سے وہ بہت پریشان تھے۔ اس لیے انہوں نے اتحاد پر بہت ہی شدت کے ساتھ زور دیا اور لکھا:

> ''ہم ایک جماعت میں متحد نہیں بلکہ مختلف سیاسی جماعتوں میں منقسم ہیں۔ حالانکہ ہمارے مقاصد کے حصول کا حقیقی راز اتحاد کے اندر مرکوز ہے۔''

انہوں نے مسلم قیادت کے سامنے یہ سوال بھی پیش کیا:

> ''اس ملک میں ہماری زندگی کا مقصد کیا ہے، مسلک اور مطمح نظر کیا ہے، اگر مقصد ایک ہے تو یہ ایک درجن جماعتیں کیوں؟ اگر مسلک کوئی حقیقی، اصلی اور قطعی شے ہے تو اس کے لیے آج تک ایک محاذ کیوں نہ بنا سکے۔''

''اسلام کا نظام حکومت'' ان کی سیاسی، علمی بصیرت کا بہترین ثبوت ہے!

منظور نعمانی

منظور نعمانی جید عالم ہونے کے ساتھ ساتھ دانشور صحافی بھی تھے جنہوں نے 'الفرقان' لکھنؤ میں انتخابات مفیدہ کے ذریعہ مذہبی اور معاشرتی ساخت کو اس شکستگی سے بچائے رکھا جو کم نگاہ، کور ذوق، ہرزہ گرد علماء سو کی وجہ سے اپنی جڑیں مضبوط کر رہی تھی۔ فساد فکر و نظر پھیلانے والوں کے خلاف انہوں نے قلمی جہاد چھیڑا اور مذہب و ملک کو داخلی انتشار و افتراق کی آگ سے محفوظ رکھا۔

یہ ان کا بہت بڑا صحافتی کارنامہ ہے جسے دنیا فراموش نہیں کرسکتی۔

اسلام کے خلاف ہونے والے خارجی اور داخلی دونوں سازشوں کا مسکت اور مدلل جواب دینے کے لیے انہوں نے ''الفرقان'' کو ترجمان بنایا اور دیکھتے دیکھتے ملی صحافت کے محاذ پر ''الفرقان'' کا شمار ان رسائل میں ہونے لگا جس کی اہمیت اور افادیت کا اعتراف معاندین بھی کرتے ہیں۔

''الفرقان'' کے ذریعہ منظور نعمانی نے ان فکری اور نظری ظلمات فوق ظلمات کا سد باب کیا جس کی وجہ سے پورا مذہبی معاشرہ ہی اپنے اصل سے انحراف اور رسوم و قیود اور توہمات کی اسیری کی وجہ سے دھندلا گیا تھا۔'الفرقان' کے ذریعہ مولانا منظور نعمانی نے اسلامی فکر کا احیاء کیا اور اس مذہبی دینی روایت کی تجدید کی، جس روایت سے شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۷۰۳-۱۷۶۲ء) اور حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کا گہرا رشتہ تھا۔'الفرقان' نے ان دونوں بزرگوں کے افکار و آثار سے عوام الناس کو نہ صرف آگاہ کیا مگر نہایت مثبت اثرات بھی ڈالے۔

معاشرہ کو ایک صحیح سمت ملی اور معاشرہ اس زیغ و ضلال سے محفوظ ہو گیا جو مذہب اور دین کے نام پر بعض شر پسندوں نے مذہب کو مسخ کرنے کے لیے اختیار کیا تھا اور مذہب و ملت میں فرقہ واریت کی فضا قائم کر کے اسلام سے الگ ایک ایسے مذہبی وجود کا ہجو کا تیار کرلیا تھا جس کا اصل اسلام سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ دہلوی پر الفرقان لکھنؤ کی خصوصی اشاعتوں سے لوگوں کے منہج فکر میں تبدیلی آئی اور ان کے اندر اپنے عقیدے اور اصل کے تحفظ کا خیال بیدار ہوا۔

'الفرقان' کی صحافت افادی تھی اور اس نے اپنے فرض منصبی کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہیں برتی بلکہ ہر سلگتے ہوئے اہم مسئلہ پر ملت اسلامیہ کی رہنمائی کی اور امت کی فکری بیداری میں اہم رول ادا کیا، سیاسی، ملی ہر محاذ پر 'الفرقان' سینہ سپر رہا اور ملت اسلامیہ کو شرار بولہبی سے آگاہ کرتا رہا اور چراغ مصطفوی کی حفاظت کرتا رہا۔

''الفرقان'' ملت اسلامیہ کا ترجمان اور نفس ناطقہ تھا۔ مولانا منظور نعمانی نے اپنی مذہبی اور سیاسی بصیرت کے امتزاج سے اس کے دائرہ اثر کو جو وسعت بخشی تھی، ویسی وسعت بہت کم مذہبی مجلات کو حاصل ہوتی ہے۔

سعید احمد اکبرآبادی

علمی و ادبی صحافت میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی کا نام نمایاں بھی ہے اور بہت سے

اعتبارات سے ممتاز بھی۔ مولانا صاحب طرز ادیب اور ذی علم دانشور اور اہل نظر تھے۔ مختلف ادبیات پر انہیں مکمل عبور تھا اور کئی زبانوں سے آگہی کی وجہ سے ان کا مطالعہ متنوع اور کئی جہات کو محیط تھا۔

ادبیات پر ان کی نظر گہری تھی اور ان کا ایک واضح ادبی موقف بھی تھا۔ جب ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا اور ہر جگہ ترقی پسند تحریک کا زور بڑھنے لگا تو دہلی میں ترقی پسند مصنفین اور مخالفین کے مابین ایک مناظرہ ہوا۔ اس مناظرہ میں ترقی پسندوں کی مخالفت میں بولنے والوں میں ایک نام مولانا سعید احمد اکبرآبادی کا بھی تھا۔

ترقی پسند تحریک کے معمار اور بنیادگزار سجاد ظہیر نے اپنی وقیع تصنیف ''روشنائی'' میں اُس مناظرے کی پوری تفصیل قلم بند کرتے ہوئے مولانا کی علمی فضیلت اور تفوق کا اعتراف کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ''مولانا سعید احمد اکبرآبادی کو ترقی پسند تحریک سے کوئی اصولی اختلاف نہیں تھا۔''

''روشنائی'' میں سجاد ظہیر نے جو تفصیل دی ہے، وہ آج کی نسل اور اردو سے تعلق رکھنے والوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوسکتی ہے۔ اس لیے اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

● ''دہلی کے میونسپل کارپوریشن کے بڑے ہال میں جلسہ ہونا قرار پایا۔ سر رضا علی (مرحوم) اس کی صدارت کے لیے بلائے گئے۔ ترقی پسند مصنفین کی تحریک پر ''حملہ'' کرنے کے لیے دلّی کے دو نامور اصحاب تھے۔ خواجہ محمد شفیع ناول اور افسانہ نگار اور شاعر، دلّی کے ایک پرانے خاندان کے فرد اور وہاں کی قدیم تہذیب و آداب اور شرفائے دہلی کی میٹھی زبان کے ماہر اور ان کی نوکیلی اداؤں پر فریفتہ اور انہیں کو انسان کے عروج کی آخری منزل سمجھنے والے۔ دوسرے قاضی سعید احمد تھے۔ یہ صاحب بالکل دوسری قسم کے تھے عربی فارسی اور علوم دینیہ کے استاد، خشخشی داڑھی، ثقہ، سنجیدہ، اس کے ساتھ ساتھ وہ ایم۔ اے بھی تھے۔ ایک جدید وضع کی ترکی ٹوپی اور شیروانی پہننے والے انگریزی دان مولوی، قاضی صاحب ندوۃ المصنفین (دہلی) کے ایک رکن تھے اور اس ادارے کے ماہانہ علمی اور دینی رسالے ''برہان'' کے ایڈیٹر تھے۔ (دارالمصنفین اعظم گڑھ کے رسالے ''معارف'' کے بعد اس زمانے میں اردو میں اسلامیات کا یہ سب سے اچھا اور سنجیدہ رسالہ تھا۔ اس کی وضع قطع بھی معارف کی طرح تھی) ترقی پسندوں کی طرف سے اس حملے کا بچاؤ کرنے کے لیے، فیض احمد فیض اور میں چنے گئے تھے۔ جاڑوں کے دن تھے اور جلسہ رات کو کوئی سات یا آٹھ بجے شروع ہوا۔

حاضرین کی تعداد کوئی ایک ہزار رہی ہوگی۔ فیض لاہور کے تھے اور میں لکھنؤ کا، اور گو ہم دہلی میں اجنبی نہ تھے، پھر بھی اپنے مخالفوں کے مقابلے میں اس لحاظ سے کمزور تھے کہ دلّی نگری کے روڑے نہ تھے اور ہم نے دو دلّی والوں کے خلاف ان کے ہی شہر میں محاذ قائم کیا تھا۔

● جلسے کے بعد خواجہ شفیع صاحب اور قاضی سعید سے میرا باقاعدہ تعارف ہوا۔ میں ان حضرات کے نام سے تو پہلے سے واقف تھا لیکن ان سے ملنے کا اس کے پہلے موقع نہیں ملا تھا۔ دونوں صاحبوں نے معذرت کی کہ بہت سی باتیں انہوں نے محض مناظرے کی خاطر کہی تھیں اور میں ان کا خیال نہ کروں۔ معلوم نہیں انہوں نے میری دلجوئی رسمی طور پر کی یا دراصل وہ ایسا محسوس کرتے تھے۔ خواجہ صاحب نے اس کے بعد مجھے باصرار اپنے دولت خانے پر بھی مدعو کیا اور ایسے مزے مزے کی چیزیں کھلائیں جو صرف دلّی والے ہی کھلا سکتے ہیں۔ ان کا اندازِ گفتگو البتہ ان کے کھانوں سے بھی مزے دار تھا۔ جب میں رخصت ہونے لگا تو اپنی تصانیف کا ایک پورا سٹ انہوں نے مجھے تحفہ میں دیا۔ میں ان کی ضیافت اور عنایت کے بوجھ سے جیسے دب سا گیا اور واپسی پر سوچتا رہا۔

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو

قاضی سعید صاحب سے بعد کو میری ملاقات ندوۃ المصنفین میں ہوئی۔ یہ علمی ادارہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اور ان کے چند رفیقوں نے دلّی میں قائم کیا تھا۔ قرول باغ میں اس کا کتب خانہ اور دفتر تھا۔ علومِ اسلامی پر تصنیف و تالیف اس کا مقصد تھا اور دسمبر ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں سے پہلے اس کا دفتر بھی خاکستر ہوگیا۔ اس نے بہت سی اچھی کتابیں اردو میں شائع کی تھیں۔ اس کے اراکین دیوبندی مکتب خیال کے حضرات تھے جنہوں نے اسلام کی دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ حبِ وطن اور سامراج دشمنی کو اپنا شعار بنایا تھا۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو میں ۱۹۳۶ء سے جانتا تھا۔ جب کہ وہ اور میں دونوں ایک ساتھ سیاسی کام کرتے تھے۔ مولانا بہت سلجھے ہوئے دماغ کے ستودہ صفات اور عالم فاضل انسان ہیں اور اس کے باوجود کہ میں جس سیاست پر کاربند تھا اس سے ان کو بہت سی باتوں میں اختلاف تھا۔ ان کی شفقت و عنایت مجھ پر ہمیشہ رہتی تھی۔ میں انہیں سامراج دشمنی، وطنی آزادی کی مشترکہ جدوجہد میں اپنا

بزرگ اور قابل احترام رفیق تصور کرتا تھا۔ میں جب بھی دلّی جاتا تو ان کی زیارت اپنا فرض سمجھتا تھا۔ بہرحال جب میں ندوۃ المصنفین میں قاضی سعید صاحب سے مولانا حفظ الرحمٰن کے ساتھ ملا تو انہیں چند دنوں پہلے کے ترقی پسندوں کے مخالف مقرر سے بالکل مختلف پایا۔ انہیں ہماری تحریک سے کوئی اصولی اختلاف نہ تھا۔

● میں نے ان سے کہا اگر ان کا یہ خیال ہے کہ ہماری تحریک کا ایک مقصد مذہب کی مخالفت کرنا بھی ہے تو یہ صحیح نہیں ہے کہ تحریک میں مختلف مذاہب اور فلسفۂ خیال کے لوگ (جن میں مارکسی خیالات والے بھی ہیں) جو چند مشترک مقاصد کے لیے متحد ہوتے ہیں جن کا ذکر ہمارے اعلان نامے میں ہے۔ نہ صرف یہ کہ مذہب کی مخالفت کرنا، ترقی پسند مصنّفین کی انجمن کے مقاصد میں نہیں ہے، ترقی پسند مصنّفین مذہبی عقائد اور دینی راہ نماؤں کا احترام کرتے ہیں اور ہر شخص کی آزادیٔ رائے اور ضمیر اور اپنے مسلک و مذہب پر قائم رہنے اور اسے برتنے کے حق کو مانتے ہی نہیں بلکہ ان حقوق پر کسی جانب سے بھی حملہ ہو تو اسے ایک بنیادی انسانی حق پر حملہ تصور کر کے اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ایسے ناروا حملے کی سختی سے مخالفت کریں۔ ترقی پسند مصنّفین لوگوں کے دینی عقائد پر حملے نہیں کرتے۔ البتہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں میں ہی سے ایک کٹر اور تنگ خیال گروہ اپنے علاوہ تمام دوسرے عقائد کے ساتھ رواداری کا اصول برتنے کو تیار نہیں ہوتا، دوسروں کی آزادیٔ ضمیر کو سلب کرنے کی برابر کوشش کرتا رہتا ہے، اس کٹر گروہ کو سماج کی رجعت پرست طاقتوں کی حمایت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ہمارا اصول عقائد کے معاملہ میں رواداری، ہر انسان کی آزادیٔ ضمیر اور مختلف مذاہب اور مسلکوں کے پیروؤں کے مابین صلح و آشتی قائم کرنا ہے۔ البتہ مذہب کی آڑ لے کر خلق خدا کا استحصال اور عقل و سائنس کی مخالفت ترقی پسندی کے اصولوں کے خلاف ہے اور ہم یقیناً ان رجحانات کے مخالف ہیں۔

اس کے بعد ہم برہان میں اسلامی تاریخ اور مسلمانوں کی تہذیب کے مختلف مسائل پر اچھے مضامین لکھوانے اور شائع کرنے کی ضرورت پر گفتگو کرتے رہے۔''

(سجاد ظہیر — روشنائی، ص: ۳۴۵-۳۵۰)

مولانا سعید احمد اکبرآبادی دہلی سے شائع ہونے والے رسالہ 'برہان'، کی ادارت سے وابستہ رہے اور اس دوران 'برہان' کی جو ادبی، مذہبی خدمات رہی ہیں، ان سے اہل دانش و بینش بخوبی

واقف ہیں۔'برہان' نے اردو زبان کی نمایاں خدمات انجام دی ہیں اور زبان کے دائرہ کو علمی و فکری اعتبار سے وسعت عطا کی۔ بہت سے اہم فکری اور ادبی مباحث کے ذریعہ اردو داں طبقہ کو آگاہ بھی کیا ہے اور ادب کو ایک نئی معنویت عطا کی، اسے مذہب، معاشرہ اور کلچر کے تناظر میں پرکھا اور اس کے افادی پہلوؤں کو روشن کیا 'برہان' کی ادبی خدمات اور اس کے منفرد زاویہ نظر کے حوالے سے ڈاکٹر عفیرہ حامد لکھتی ہیں:

''دہلی سے ماہنامہ ''برہان'' ۱۹۳۸ء میں جاری ہوا۔ اس کے ایڈیٹر سعید احمد اکبرآبادی تھے۔ یہ علمی و ادبی رسالہ تھا۔ اس نے مذہب، تاریخ، عمرانیات، لسانیات اور احادیث کو اپنے صفحات میں جگہ دی۔ ''برہان'' نے اردو زبان کے مسئلے کو شرعی نقطہ نظر سے پیش کیا اور مختلف آیات کے حوالوں سے یہ بات ثابت کی کہ کسی قوم کی تہذیب و تمدن کا تحفظ اور بقا اس کی زبان میں مضمر ہے۔'برہان' نے اپنے مضامین کے ذریعہ اردو زبان کی الگ حیثیت متعین کی اور مسلمانوں کی بقا کے لیے اس کے تحفظ کو اہم قرار دیا تاکہ مسلمان اپنا وجود اپنی زبان کے ذریعہ برقرار رکھ سکیں۔'برہان' نے اسلامی علوم و فنون اور اسلامی تاریخ کو فروغ دینے میں اہم خدمات انجام دیں اور مسلمانوں کے بنیادی عقائد کو قرآن و سنت کی روشنی میں بیان کیا۔ یہ دور ادب میں جدید نظریات کے فروغ کا دور تھا۔ اس نے ادب کے رشتے کی اہمیت کا احساس قرآن و حدیث کی روشنی میں دلایا۔'برہان' کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اس نے اردو زبان کے تحفظ کے لیے منفرد نظریے کو اپنایا اور شرعی نقطۂ نظر سے اس کی وضاحت کی۔ اس لیے اس کی ادبی خدمات کو اس دور کا ہر رسالہ تسلیم کرتا ہے جس نے دین اسلام اور تاریخ اسلام کو اردو داں طبقے میں دوبارہ زندہ کیا'' (اردو ادبی رسائل کا جائزہ، مخزن لاہور، ۷)

سعید احمد اکبرآبادی کی علمی، ادبی، صحافتی سرگرمیاں صرف برہان تک ہی محدود نہیں تھیں بلکہ ملک اور بیرونِ ملک کے مقتدر مجلات میں متنوع موضوعات پر ان کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ اسلامیات، تاریخ، تصوف کے علاوہ ادبیات پر بھی ان کے مقالات کی تعداد خاصی ہے۔ اقبال اور غالب کے تعلق سے بھی ان کے رشحات ادبی حلقے میں اعتبار و تحسین کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ سعید احمد اکبرآبادی صحیح معنوں میں کثیر الجہات تھے اور ان کی شخصیت میں علم و ادب کا حسن امتزاج تھا۔

سید فضل الرحمٰن قاسمی

سید فضل الرحمٰن قاسمی کا شمار بھی ممتاز صحافیوں میں ہوتا ہے جن کے ہفت روزہ اخبار 'مسلم گزٹ' کٹک سے اڑیسہ کی اردو صحافت کو نئی سمت ملی اور بقول حفیظ اللہ نیولپوری 'مسلم گزٹ' اڑیسہ میں اردو صحافت کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز تھا۔ اس کا سن اشاعت ۱۹۳۷ء ہے۔ آٹھ صفحات پر مشتمل اس اخبار میں خبروں کے علاوہ حالات حاضرہ پر تبصرے اور تجزیئے بھی شامل ہوتے تھے۔ عرب اور مغربی ممالک کے احوال بھی اس اخبار میں شائع ہوتے تھے۔ اخبار کے اداریئے سے حالات حاضرہ سے مدیر کی مکمل آگہی اور گہری سیاسی، صحافتی بصیرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

اس اخبار نے جہاں مسلمانوں میں تعلیمی بیداری پیدا کی اور انہیں اپنی سماجی ذمہ داریوں کا احساس دلایا۔ وہیں یہ اخبار مسلمانوں کا نمائندہ اور کانگریس کا حامی تھا۔ اس اخبار کا مقصد جہاں اڑیسہ میں اردو کی اشاعت تھی، وہیں اردو تعلیم کے فروغ میں بھی اس اخبار نے قائدانہ کردار ادا کیا۔

ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری نے 'مسلم گزٹ' کے تیسرے شمارے سے اداریئے کا ایک اقتباس پیش کیا ہے جو ینگ مسلم ایسوسی ایشن کے قیام سے متعلق ہے۔ اداریئے سے مدیر کی ملی حمیت اور دردمندی کا اندازہ ہوتا ہے:

> ''اس دور اختلاف میں جب کہ مسلمانوں کا شیرازہ بالکل منتشر ہو چکا ہے، ان کے کالجوں سے لے کر یونی ورسٹی تک، اسکول سے لے کر مدرسہ و مکتب تک، اسمبلی سے لے کر کونسل ڈسٹرکٹ بورڈ میونسپل بورڈ تک، غرض کہ مسلمانوں کا کوئی ایسا ادارہ، کوئی ایسی انجمن یا کمیٹی نہیں جہاں اختلاف و نفاق کا مادہ فاسد موجود نہ ہو۔ حقیقتاً ادارہ و انجمن کے قیام کا مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ انسانی افراد کو یا خاندان آدم کو ایک زنجیر نظام میں جکڑ دیا جائے۔ یہی نظام قوموں میں اتحاد خیال و اتحاد آراء پیدا کرتا ہے جس سے پستی سے نکل کر قوم بام عروج پر پہنچ گئی۔''

اس اخبار میں جمعیۃ علمائے ہند شاخ اڑیسہ کی خبریں نمایاں اور ترجیحی طور پر شائع ہوا کرتی تھیں۔ اڑیسہ میں اردو صحافت کا یہ مینار جلد ہی منہدم ہو گیا اور اردو والوں کی بے حسی نے ایک اچھے اخبار کو مرحوم و مغفور بنا دیا۔

احمد مصطفیٰ راہی

احمد مصطفیٰ راہی، کہنہ مشق صحافی ہیں اور صحافتی حلقہ میں انہیں اعتبار بھی حاصل ہے۔ صحافت،

ان کے لہو میں شامل ہے۔ مولانا عبدالوحید صدیقی کے فیض تربیت سے انہوں نے صحافتی میدان میں نئے نئے نو بہ نو تجربے کئے۔

راہی ایک مذہبی ڈائجسٹ ''ہدیٰ'' کے مدیر ہیں۔ یہ مجلہ مذہبیات کے لئے مختص ہے اور اس کا امتیاز وہ خصوصی شمارے ہیں جو مختلف مذہبی موضوعات پر شائع ہوئے ہیں۔ ''قرآنیات'' سے لے کر حکایات الصالحین تک ''ہدیٰ'' نے بھٹکے ہوئے آہوؤں کو سوئے حرم لانے کی کوشش کی ہے۔

''ہدیٰ'' نے آج کی زرد صحافت کے دور میں جب کہ مسلمان خود اپنی اسلامی اساس کو فراموش کر چکے ہیں۔ ان کو اپنا منصب یاد دلانے کی کوشش کی ہے۔ گویا ''ہدیٰ'' ملت اسلامیہ کے لیے ایک مینارہ نور ہے۔ قرآن کریم نمبر، نزول قرآنی نمبر، فہم قرآن نمبر اور اولیاء اللہ نمبر، لبیک نمبر، ''ہدیٰ'' نے اس طرح کے اسلامی موضوعات پر جو کام کیا ہے، وہ نہ صرف قابل ستائش ہے بلکہ اب ہدیٰ کے خصوصی شماروں کے حوالے سے علوم اسلامیہ کے شعبہ جات کو تحقیق کرنی چاہیے اور اسلامیات کے فروغ میں ''ہدیٰ'' کے فعال کردار کو تسلیم کرنا چاہیے۔

احمد راہی نے اپنے صحافتی تجربات کو 'مقصد خیز' میں صرف کیا اور اپنے تجربات کو ضائع ہونے سے بچا لیا۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ یہ ان کے لیے زادِ آخرت بھی ہے اور سامانِ مغفرت بھی۔

اشرف سعودی

مجلاتی صحافت کے ضمن میں 'سلسبیل' اور اس کے مدیر اشرف سعودی کا ذکر بھی ناگزیر ہے کہ یہ رسالہ نہ صرف صوری اور معنوی اعتبار سے اہم ہے بلکہ اس رسالے نے طلباء کی ذہنی و فکری تعمیر و تشکیل، صحافتی تربیت میں بھی اہم رول ادا کیا ہے۔

دارالعلوم سبیل الرشاد بنگلور ترجمان مجلہ 'سلسبیل' کی تاریخ اشاعت جولائی ۱۹۸۱ء ہے۔ جس کی پوری تفصیل ڈاکٹر انیس صدیقی نے یوں درج کی ہے:

> ''سلسبیل، نہ صرف جاذب نظر گٹ اَپ بلکہ مشمولات کے اعتبار سے بھی ہم عصر رسائل میں ممتاز ہے۔ ''سرچشمہ'' اداریے کا عنوان ہے جس میں عہد حاضر میں ملت اسلامیہ کو درپیش مسائل پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ 'آبِ حیات' کے زیر عنوان درس قرآن اور 'لب جو' کے تحت امیر شریعت مولانا ابوالسعود احمد کے مختلف مسائل پر فتوے شائع کیے جاتے ہیں۔ 'نہریں' میں فقہی مسائل پر مشاہیر علمائے دین کے مبسوط اور جامع مقالات کی اشاعت عمل میں آتی ہے۔ 'جل ترنگ' مذہبی اور اصلاحی نوعیت کی

منظومات کا کالم تھا۔ 'گہرائیاں' کے عنوان سے نئی کتابوں پر تبصرے شائع کیے جاتے ہیں۔ 'سلسبیل' میں اکثر و بیشتر طلبائے سبیل الرشاد کے معلوماتی مضامین کی اشاعت کا بھی اہتمام کیا جاتا۔ 'سلسبیل' کے کئی وقیع خاص نمبر بھی شائع ہوئے جن میں 'تبلیغ نمبر' اور پرسنل لانمبر قابل ذکر ہیں۔'' (کرناٹک میں اردو صحافت، ص: ۱۸۵)

مجلّہ کی تہذیب ترتیب اور عنوانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مدیر کا ادبی ذوق نہایت بالیدہ ہے اور رسالے کو مربوط اور منظم انداز میں پیش کرنے کی صلاحیت ہے اور اس بات کا احساس ہے کہ مجلّہ کسی طرح کے بکھراؤ کا شکار نہ ہو بلکہ اس میں ایسی ترتیب و تنظیم ہو کہ عام قاری کو بھی اس سے مکمل استفادہ میں آسانی ہو۔

اعجاز عرفی

اعجاز عرفی بھی ادبی صحافت سے وابستہ رہے ہیں۔ ان کی ادارت میں شائع ہونے والا سہ ماہی 'وقار' کلّی برِدوان، خالص ادبی نوعیت کا رسالہ ہے جس میں جدید و قدیم ادبی موضوعات و مباحث پر فکرانگیز تحریریں شائع ہوتی تھیں اور یہ رسالہ صحت مند ادبی قدروں کا امین اور نظریاتی تنازعات کے دور میں غیر جانب داری کا نقیب رہا ہے۔ مدیر کے شستہ، شائستہ ادبی ذوق کا آئینہ دار اور خوش سلیقگی اور حسن انتخاب کا مظہر 'وقار' ایک ایسے منطقے سے شائع ہوتا ہے جہاں اردو کی لسانی آبادی کم ہے مگر مدیر محمد اعجاز عرفی نے اردو زبان کے تعلق سے اپنے اداریئے 'حرف وقار' میں جس طرح اظہار خیال کیا ہے اور زبان و بیان کی جمالیات کے جادو سے قاری کو مسحور کرنے کی کوشش کی ہے، اس سے اردو زبان کی ہمہ گیری، محبوبیت، مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ رعنائی و زیبائی، صباحت و ملاحت سے معمور اداریئے کا ایک اقتباس دیکھئے:

''اردو ہندوستان کی ایک ایسی انقلابی اور ہمہ گیر زبان ہے جو ملک کے ہر گوشے اور ہر چپہ میں بولی اور سمجھی جاتی ہے جس کے دامن پر تہذیب و تمدن کی گلکاریاں ہیں جس کے جلو میں خوبی و زیبائی اور دلکشی و رعنائی کے خزانے ہیں جو مغل حکومت میں مختلف قوموں کے اختلاط سے پیدا ہوئی جس کی ترویج و ترقی میں ہر مذہب و مسلک سے تعلق رکھنے والوں نے مشترکہ طور پر حصہ لیا، اسے پروان چڑھایا۔''

سہ ماہی ''وقار'' میں عصری ادبی موضوعات پر مضامین، افسانے، غزلیات اور منظومات کے ساتھ بے لاگ، بے باک، تجزیئے بھی شائع ہوتے تھے۔

ادبی صحافت کی تاریخ میں سہ ماہی 'وقار' کلکی کا نام بھی زریں حرفوں سے لکھا جائے گا کہ مشرقی دانش گاہوں کے فیض یافتہ تخلیق کاروں کے تخلیقی تموجات اور تفاعلات سے آگہی کا ایک عمدہ ادبی وسیلہ تھا۔ سہ ماہی 'وقار' کے ذریعہ بعض وہ قلمکار بھی روشناس ہوئے جو شاید ادبی خود اعتمادی کی کمی کی وجہ سے گوشۂ گمنامی میں ہوتے۔ 'وقار' نے نوخیز قلم کاروں میں اعتماد پیدا کیا، کسی ادبی رسالے کا یہ بہت بڑا فیض اور بہت بڑی عطا ہے۔

نئی نسل کا صحافتی کردار

دیوبند کی نئی نسل بھی ذرائع ابلاغ کی قوت اور مغرب کے monolithic media کے مضمرات سے آگاہ ہے۔ اس لیے مغربی میڈیا کے منفی کردار سے مبارزت کے لیے یہ نسل ہمہ وقت متحرک رہتی ہے۔ مذہب، زبان اور کلچر پر گلوبلائزیشن کے پڑنے والے منفی اثرات سے آگاہ اس نسل نے نہ صرف یہ کہ کمرشیل ازم اور مصنوعات کی موکل میڈیا کے خلاف محاذ تیار کرلیا ہے بلکہ اپنی تحریروں کے ذریعے وہ اسلامی افکار و اقدار کی اشاعت بھی کر رہے ہیں۔ عصری اسلوب میں اسلامی نظام کو منطقی ترتیب کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔

نئی نسل نے صحافت کے نئے موضوعات اور مسائل کی طرف بھی اپنی توجہ مرکوز کی ہے۔ یہ نسل جہاں اسلامیات، سماجیات، سیاسیات، اقتصادیات پر لکھتی ہے وہیں ادبیات، صحت، سائنس، تعلیم و تدریس، قومی ترقیاتی مسائل اور ٹکنالوجی پر بھی لکھ رہی ہے۔ دیوبند کی نئی نسل جہاں انٹرنیٹ اور CD کے مضرات پر قلم اٹھاتی ہے جیسے سید آصف الدین قاسمی۔ وہیں گلوبلائزیشن پر بھی لکھتی ہے جیسے یاسر ندیم۔ دیوبند کی نئی نسل نے ان موضوعات کا بھی احاطہ کیا ہے جن کا تعلق ہماری تاریخی، ثقافتی میراث اور مشترکہ تہذیبی وراثت سے ہے۔ معاصر سیاسی سماجی مسائل پر جہاں نسیم اختر شاہ قیصر، یوسف رام پوری، عبدالصمد پورنوی، مقصود الحسن قاسمی، عبدالقادر شمس قاسمی، عبدالواحد قاسمی، اعجاز ارشد قاسمی، نوراللہ جاوید، وارث مظہری لکھ رہے ہیں وہیں یو۔ این۔ آئی سے وابستہ عابد انور کی تحریریں قومی، سیاسی، سماجی، معاشی، ترقیاتی مسائل، خواتین و اطفال اور دیگر ان موضوعات پر شائع ہورہی ہیں جن سے دینی طبقے کی آشنائی کم ہے یا جن موضوعات کو مس کرنا یہ لوگ ضروری نہیں سمجھتے۔ عبدالحمید نعمانی اور عقیدت اللہ قاسمی کی سیاسی، مذہبی، علمی تحریروں میں شعور و اظہار کی جو پختگی ملتی ہے وہ معاصر اردو صحافیوں میں کم نظر آتی ہے۔

دیوبند کے فضلاء متنوع صحافتی موضوعات اور سماجی، سیاسی، اقتصادی مسائل پر نہایت باریک

بنی سے لکھ رہے ہیں جوان کے تابناک مستقبل کی گواہی دے رہے ہیں۔

اردو کے علاوہ انگریزی اور ہندی صحافت میں بھی دیوبند کے فضلا سرگرم عمل ہیں۔ منظر امام قاسمی انگریزی کے صحافی ہیں۔'ملی گزٹ' دہلی (ایڈیٹر: ڈاکٹر ظفرالاسلام خاں) سے وابستہ رہے ہیں۔ مختلف عصری سیاسی موضوعات پر ان کی تحریروں اور رپورٹس کو انگریزی داں حلقے اور دانش ور طبقے نے سراہا ہے۔ اسی طرح سلیمان اختر فاروقی اور عبدالباسط قاسمی بھی انگریزی صحافت میں اپنی شناخت قائم کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ ہندی صحافت میں اعجاز الرحمٰن شاہین نے اپنی پہچان بنالی ہے۔ وہ ایک ہندی مجلّے کے مدیر بھی ہیں جس کے ذریعے وہ اسلام کا پیغام ان طبقات تک پہنچاتے ہیں جو اردو زبان، تہذیب اور مسلم کلچر اور تاریخ سے ناآشنا ہیں۔ یہ ایک بڑا اور مفید کام ہے جو شاہین انجام دے رہے ہیں۔

صحافت کے میدان میں فضلاء دیوبند کی پیش قدمی سے معاصر اردو صحافت کا طرز احساس و اظہار بھی تبدیل ہوا ہے اور اردو صحافت کو نئی توانائی بھی ملی ہے۔ دیوبند کے فضلا نے اپنی علمیت اور ترسیلی لیاقت سے بھی عوام الناس کی سائیکی اور شعور کی تبدیلی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

اردو کے بیشتر اخبارات اور مجلّات سے فضلاء دیوبند کا بہت مضبوط رشتہ ہے۔ ہندوستان کے بیشتر اہم اور موقر اخبارات مثلاً ''انقلاب'' ممبئی، ''منصف'' حیدرآباد، ''اردو ٹائمز'' ممبئی، ''سیاست'' حیدرآباد، ''اخبار مشرق'' کولکاتہ، ''آزاد ہند'' کولکاتہ، ''ندیم''، بھوپال ''راشٹریہ سہارا'' نئی دہلی، ''قومی تنظیم'' پٹنہ، ''فاروقی تنظیم'' رانچی، وغیرہ وغیرہ میں ان کی تحریریں اہتمام کے ساتھ شائع ہو رہی ہیں اور ان تحریروں کا اعتبار بھی قائم ہو رہا ہے!

❂❂❂

ادبی اُفق

اردو کے عظیم نقاد۔مولانا اشرف علی تھانوی

مولانا اشرف علی تھانوی، اردو کے بڑے نقاد تھے۔اگر میں یہ بات کہوں تو اردو ادب کے بہت سے سنگ بدست اجارہ دار مجھے لہولہان کردیں گے۔مجھ پہ تبرا بھیجیں گے،طعن وتشنیع کریں گے اور مجھے ادب بدر کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔کیونکہ مولانا تھانوی کی علمی حیثیت سے یہ آشنا ہوں یا نہ ہوں۔مگر ان کی ادبی حیثیت سے قطعی آگاہ نہیں ہیں۔جب کہ اپنی ناقص اردو پہ اترانے والے کیا جانیں کہ زبان کیا ہوتی ہے، ادب کسے کہتے ہیں اور شعور نقد کیا ہوتا ہے۔پھر ان کی معلومات کا خانہ بھی اکثر وبیشتر خالی ہوتا ہے اس لیے ان سے الجھنے کے بجائے بہتر یہی ہے کہ میں اپنے قول کی تائید وتوثیق کے لیے اس شخص کا سہارا لوں جس نے ادب کے اعماق میں اتر کر اسے سمجھا ہے اور ادب کے باطنی مدوجزر کو اپنے باطن میں سمویا ہے اور دشت ادب کی مکمل سیاحی کی ہے اور جس نے ادبیات عالیہ کا بہ استغراق وانہماک مطالعہ کیا ہے۔

دنیا اس شخص کو حسن عسکری کے نام سے جانتی ہے اور یہ حسن عسکری اس بین تہذیبی اور علوی شخصیت کا نام ہے جس نے تنقید کو بہت کچھ دیا ہے۔حسن عسکری نے حقیقی ثقافتی تہذیبی نقطے کو تلاش کیا اور ادب کی ابدی ماہیت کو دریافت کیا۔دراصل انہوں نے فکر کے اس نقطے کی جستجو کی جو تخلیق یا تنقید کا محور بن سکے۔انہوں نے مشرق کی بنیادی فکر کے سرچشموں کو دریافت کیا اور فکر کے ان مصادر کی طرف رجوع ہوئے جس کے اندر مشرقیت کی روح ہے۔رینے گینوں (عبدالواحد یحییٰ) اور حضرت

اردو کے عظیم نقاد۔مولانا اشرف علی تھانوی

مولانا اشرف علی تھانوی، اردو کے بڑے نقاد تھے۔اگر میں یہ بات کہوں تو اردو ادب کے بہت سے سنگ بدست اجارہ دار مجھے لہولہان کردیں گے۔ مجھ پہ تبرا بھیجیں گے،طعن و تشنیع کریں گے اور مجھے ادب بدر کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ کیونکہ مولانا تھانوی کی علمی حیثیت سے یہ آشنا ہوں یا نہ ہوں۔مگر ان کی ادبی حیثیت سے قطعی آگاہ نہیں ہیں۔ جب کہ اپنی ناقص اردو پہ اترانے والے کیا جانیں کہ زبان کیا ہوتی ہے، ادب کسے کہتے ہیں اور شعور نقد کیا ہوتا ہے۔ پھر ان کی معلومات کا خانہ بھی اکثر و بیشتر خالی ہوتا ہے اس لیے ان سے الجھنے کے بجائے بہتر یہی ہے کہ میں اپنے قول کی تائید و توثیق کے لیے اس شخص کا سہارا لوں جس نے ادب کے اعماق میں اتر کر اسے سمجھا ہے اور ادب کے باطنی مد و جزر کو اپنے باطن میں سمویا ہے اور دشت ادب کی مکمل سیاحی کی ہے اور جس نے ادبیات عالیہ کا بہ استغراق و انہماک مطالعہ کیا ہے۔

دنیا اس شخص کو حسن عسکری کے نام سے جانتی ہے اور یہ حسن عسکری اس بین تہذیبی اور علومی شخصیت کا نام ہے جس نے تنقید کو بہت کچھ دیا ہے۔حسن عسکری نے حقیقی ثقافتی تہذیبی نقطے کو تلاش کیا اور ادب کی ابدی ماہیت کو دریافت کیا۔ دراصل انہوں نے فکر کے اس نقطے کی جستجو کی جو تخلیق یا تنقید کا محور بن سکے۔انہوں نے مشرق کی بنیادی فکر کے سرچشموں کو دریافت کیا اور فکر کے ان مصادر کی طرف رجوع ہوئے جس کے اندر مشرقیت کی روح ہے۔ رینے گینوں (عبدالواحد یحییٰ) اور حضرت

مولانا اشرف علی تھانوی کی طرف فکری مراجعت کو بعض لوگ ''رجعت قہقری'' کا نام دے سکتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مغربی خماریوں سے مرعوب ہو کر سوچنے اور لکھنے والے ان کی اترن پر اترانے والے بہت سی بنیادی حقیقتوں کو فراموش کر بیٹھتے ہیں۔ مشرق کی فکری عظمت کے نشانوں کی تلاش، بازیافت اور ادب پر مشرقی روایت کے فکری اطلاقات کیا غلط ہیں؟— میرا خیال ہے کہ ثقافتی اور ادبی اعتبارات سے مشرق کو مغرب پر برتری اور تفوق حاصل ہے۔ مغرب سے محبت، مشرق سے بیزاری، نوآبادیاتی استعماری ذہن کی دین ہے۔ بہر حال حسن عسکری نے ''وقت کی راگنی''، ''ستارہ یا بادبان'' اور ''آدمی اور انسان'' میں جو مضامین لکھے ہیں اور تنقید کی جن نئی جہتوں کو تلاش کیا ہے، اسے نکارنا ناممکن ہے۔ حسن عسکری نے بہت ہی اہم مسائل اور موضوعات پر مضامین لکھے۔ مگر اپنے تنقیدی خیالات کو تعصبات کا نام دیا۔ انہوں نے کوئی ادعائی یا اذعانی رویہ اختیار نہیں کیا۔ بلکہ حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کو بھی انہوں نے ایک ''لڑکھڑاتی کوشش'' سے تعبیر کیا۔ یہ اور بات کہ حسن عسکری کی یہ لڑکھڑاتی کوشش بہتوں کی مسلسل، متواتر، مضبوط سعی و کاوش پر بھاری ثابت ہوئی۔ ان کی تنقید آج بھی بھاری پتھر کی مانند ہے جو ناقص فہم ناتوانوں سے نہیں اٹھ سکتی۔ آج جب کہ بقول میر ہر ناقص اپنے زعم میں صاحب کمال ہے۔ ان لوگوں کو حسن عسکری کی تنقید سے اکتساب نور کرنا چاہیے۔ کیونکہ انہوں نے روایت کے اس تصور کو تلاش کیا تھا جس سے ادبیات کی تفہیم میں مکمل معاونت مل سکتی ہے۔ انہوں نے ادبیات کی تفہیم کے لیے اور تعین قدر کے لیے جس منہج کو اور جس تصور کو اپنایا، اُس سے بہتوں کو ذہنی جھٹکا لگ سکتا ہے۔ کیونکہ آخری ایام میں انہوں نے مولانا اشرف علی تھانوی کو اپنا روحانی رائد ہی نہیں بلکہ ادبی قائد بھی تسلیم کر لیا تھا۔ وہ ہر شعبۂ حیات میں مولانا تھانوی کو ہی صائب الرائے اور صحیح الفہم سمجھتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اردو کی اصل شعری روایت کو جاننا ہے تو مولانا اشرف علی تھانوی صاحب کی تحریریں پڑھنا چاہیے۔ چنانچہ ادبی معیارات کے تعین اور ادبیات کی تفہیم میں بھی انہوں نے مولانا تھانوی کو اپنا مقتدا و ہادی سمجھا اور مولانا تھانوی کو اردو کا ایک بڑا نقاد قرار دے دیا جس پہ بہت سے ناقدوں کی جبینیں شکن آلود ہوئیں اور انہوں نے اس عمل کو حسن عسکری کے فکری اضمحلال اور ذہنی انحطاط سے تعبیر کیا۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ مولانا تھانوی کے اندر جو ادبی فہم و شعور تھا اس سے بہت سے نام نہاد نقاد بھی عاری ہیں۔ مولانا تھانوی کے تنقیدی ذہن رسا کا ثبوت تو شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی پیش کیا ہے:

> ''ہماری شعریات (یعنی عرب + ایرانی اور ہند + ایرانی شعریات) میں عندیہ مصنف کو مرکزی حیثیت کبھی حاصل نہیں ہوئی... مولانا تھانوی کا قول ہے— حافظ کے کلام میں

سلوک کے مسائل بکثرت ہیں اور یہ نہیں کہ یہ مسائل محض اعتقاد کی وجہ سے ہم لوگوں نے ان کے کلام سے نکال لیے بلکہ ان کا کلام واقعی تصوف کے مسائل سے بھرا ہوا ہے ورنہ کسی دوسرے کے کلام سے تو کوئی یہ مسائل نکال دے۔ بات یہ ہے کہ جب تک اندر کچھ نہیں ہوتا اس وقت تک کوئی نکال بھی نہیں سکتا۔۔۔ حضرت تھانوی کے جس وعظ سے یہ بیان اخذ کیا گیا ہے اس پر تاریخ ۲۱ جمادی الثانی ۱۳۴۰ھ (مطابق ۳۰ رفروری ۱۹۲۲ء) درج ہے۔گویا جوبات دریدانے ۱۹۸۷ میں کہی اسے مولانا تھانوی ساٹھ پینسٹھ برس پہلے کہہ چکے تھے۔'' (شعرِ شور انگیز، جلد دوم ص:۸۷)

اب اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حسن عسکری کا قول کس قدر مبنی برحقیقت ہے۔ اُن کی عقیدت بے معنی اور غیر منطقی نہیں بلکہ اُس کی ایک مضبوط اساس ہے۔

جوہر شناس حسن عسکری نے اپنے ادبی مضامین میں مولانا تھانوی کا جس عقیدت سے ذکر کیا ہے، اتنی عقیدت سے تو ہمارے نقاد ایلیٹ اور ایذرا پاؤنڈ، ایف آر لیوس کا بھی شاید ہی کرتے ہوں۔ حسن عسکری کا یہ اقتباس دیکھیے جس سے اندازہ ہوگا کہ مولانا تھانوی کی تحریریں نہ صرف اردو اور فارسی ادب کی تفہیم میں معاون ہوسکتی ہیں بلکہ مغربی ادبیات کی تفہیم میں بھی مولانا تھانوی سے رہنمائی مل سکتی ہے۔

● ''حضرت مولانا تھانویؒ کی شرح غزلیات حافظ اور شرح مثنوی مولانائے روم عرصے تک رسالوں میں قسط وار شائع ہوتی رہی ہیں۔ حضرت کا مقصد تو خیر دینی تھا لیکن جو چاہے صرف ان دو کتابوں سے شاعری کی پوری تعلیم اخذ کرسکتا ہے بلکہ جو شخص بھی صحیح معنوں میں شاعری سے آگاہی حاصل کرنا چاہے، اس کے لیے موجودہ حالات میں واحد ذریعہ یہی دو کتابیں ہیں۔ غرض جن حضرات کو ہماری روایت کی نمائندگی کا واقعی حق حاصل تھا۔ ان کی تائید اور حمایت سے ادب جیسی ثانوی چیز بھی محروم نہیں رہی۔

پھر یہ بھی نہیں کہ مولانا تھانوی نے اردو شاعری کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا۔ حضرت کے مواعظ میں، ملفوظات میں اور دوسری تحریروں میں جابجا ایسے اشارے ملتے ہیں جو درحقیقت پوری کتاب ہیں، جو لوگ ادبی نقاد سمجھے جاتے ہیں، ان کی لمبی چوڑی تحریروں میں اردو شاعری کے متعلق ایسے حقائق ڈھونڈے سے بھی نہ ملیں گے۔ یہاں اس موضوع پر پوری بحث تو ممکن نہیں صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے، عقلمندوں کے

لیے وہی کافی ہوگی۔ کہا جاتا ہے کہ مومن کی اہمیت سے لوگ اس وقت واقف ہوئے ہیں جب نیاز فتح پوری نے ان کی طرف توجہ دلائی۔ مگر حضرت مولانا کہہ چکے ہیں کہ دہلی کے شاعروں میں جو بات مومن میں ہے، وہ اوروں میں نہیں، اسی طرح امیر مینائی کے کلام کی وہ تعریف کی ہے جو آج تک ادبی نقاد نہیں کرسکے۔ مطالب اور مضامین کے سلسلے میں حضرت، رنگینی اور سنگینی کے فرق پر بہت زور دیتے ہیں، یہ فرق سمجھنے کے لیے پہلے غالب کا یہ شعر ملاحظہ فرمایئے:

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

حضرت مولانا تھانویؒ نے اس شعر کی یہ خامی بتائی ہے کہ غالب نے صرف ظاہری حالت کو نظر میں رکھ کر شعر کہہ دیا ہے، حقیقت کو نہیں دیکھا اگر کسی کے جسم میں تیر لگے تو واقعی وہی حال ہوگا جو غالب نے دکھایا ہے مگر عشق حقیقی میں تو جتنا علاقہ بڑھتا جائے گا، خلش بھی اتنی ہی بڑھتی جائے گی۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ سے قرب بھی مجھ کو ہی تم سے زیادہ حاصل ہے اور اللہ تعالیٰ سے خوف بھی مجھے ہی زیادہ ہے۔ یہ حال تو ہوا غالب کی رنگینی کا۔ اتفاق سے ذوق کا بھی ایک شعر اسی مضمون کا مل گیا۔ اب سنگینی دیکھئے:

خدنگِ یار مرے دل سے کس طرح نکلے
کہ اس کے ساتھ ہے اے ذوق میری جان لگی

ساتھ ہی ذوق کے تین شعر اور دیکھئے جس میں سنگینی کے ساتھ ایسی رنگینی ہے جو غالب کو نصیب نہیں ہوئی:

قاتل کیسے جیسو ذوق طپیدن دیکھئے کیا ہو
کہ اب تک ذبح کرنے کا نہیں قاتل کو ڈھب آیا
بلائے لب نہ بہر آفریں ہم نے تہِ خنجر
کہ قاتل بدگماں ہے جانے اپنے جی میں کیا سمجھے
ترے ڈر سے نہ آیا پاس کوئی نیم جانوں کے
مگر رونا کبھی چپکے سے بعد از نیم شب آیا

غالب کے یہاں منصور کا مضمون بار بار آیا ہے۔ مثلاً:

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں

اسی مضمون کو ذوق وہاں لے گئے ہیں جہاں تک غالب کی رسائی نہیں:

سمجھ یہ دار و رسن تار و سوزن اے منصور
کہ چاک پردہ حقیقت کا ہیں رفو کرتے

اسی طرح قطرۂ دریا کا مضمون غالب کو عزیز ہے لیکن ذوق کو مضمون کے ہر پہلو پر جو گرفت حاصل ہے اس کا نشان تک غالب کے پورے کلام میں نہیں ملتا۔

کیوں کر حباب ہوسکے دریائے بیکراں
دریا سے جب تلک نہ ملے ٹوٹ پھوٹ کے

اب ذوق کا ایک آخری شعر اور سن لیجیے جس سے ارسطو اور سارے مغربی فلسفیوں کی بنیادی خامی اور ان کے ادبی نظریوں کی ناپختگی اور اس کے مقابلے میں ہمارے ادب کی جامعیت ہر چیز روشن ہو جائے گی، بلکہ اس مضمون میں جتنی معروضات پیش کی گئی ہیں ان کے ثبوت کے لیے یہ شعر کافی ہے جس کا مضمون ذوق نے براہِ راست قرآن شریف سے لیا ہے:

احاطے سے فلک کے ہم تو کب کے
نکل جاتے مگر رستہ نہ پایا

ان اشعار پر تبصرہ کی گنجائش نہیں مگر امید ہے کہ ان اشعار کی مدد سے مولانا تھانویؒ کے فقرے کا مطلب سمجھ میں آ سکے گا اور یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ جدید تعلیم پانے والوں نے ہماری دینی روایات کے مستند نمائندوں کا دامن چھوڑ کر تہذیب اور ادب کے میدان میں بھی کیا کچھ کھو دیا— اور یہ جو "کچھ" اتنی بڑی چیز ہے کہ اس کے مقابلے میں مغرب کا ادب بغیر کسی مبالغے کے محض بچوں کا کھیل ہے۔"

حسن عسکری نے نہ صرف یہ کہ مغرب کے تصورِ روایت کو مسترد کیا بلکہ یہ بھی بانگ دہل اعلان کیا کہ مغربی ادبیات کی تفہیم میں مولانا تھانوی کی تصنیفات ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔ اتنا جرأت مندانہ جملہ، کم از کم اردو کا کوئی جغادری نقاد تو نہیں لکھ سکتا۔ یہ جرأت رندانہ صرف حسن عسکری جیسے وسیع المطالعہ شخص ہی کا حصہ ہے۔ مگر یہ دعویٰ بلا دلیل نہیں ہے۔ انہوں نے بہت ہی معروضی اور منطقی طور پر اپنے دعوے کو مبرہن کیا ہے:

"حضرت مولانا تھانوی کو ادبی نقاد کہوں تو ان کی شان میں گستاخی ہوگی مگر ان کا کمال یہ

ہے کہ شعر و ادب کی تعلیم بھی ان کی کتابوں سے حاصل ہوسکتی ہے۔ یہ رائے ظاہر کرنے سے پہلے میں نے سو صفحے کے اقتباسات ان کی چند کتابوں سے نقل کر کے تیار کر لیے تھے۔ یہ اقتباس بھی تین طرح کے ہیں پہلے تو وہ رائیں ہیں جو حضرت نے براہِ راست کسی شاعر یا شعر کے متعلق ظاہر کی ہیں۔ دوسرے وہ بیانات ہیں جن سے کسی ایسے مضمون کی تشریح ہوتی ہے جو فارسی اور اردو شاعری میں بار بار آتا ہے۔ تیسرے وہ بیانات ہیں جن کا بظاہر تو ادب سے کوئی تعلق نہیں، مگر جن سے ادبی اصولوں کا استخراج ہوسکتا ہے۔ یہ انتخاب تیار کرنے میں بھی میں نے تجرباتی طریقہ کار سے کام لیا ہے — مضمون میں تو میں نے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ مولانا تھانویؒ کی کتابوں سے اردو اور فارسی ادب کے بارے میں ہدایت مل سکتی ہے۔ اب ترقی کر کے یہ دعویٰ کروں گا کہ مغربی ادب کو سمجھنا ہو تو بھی ان کی کتابوں کی ضرورت پڑے گی۔ یہ بات بہت سے حضرات کو گراں گزرے گی۔ مگر پہلے مغربی ادب کے متعلق چند گذارشات سن لیجیے اور اگر ضمناً چند مصنفوں یا کتابوں کے نام آجائیں تو شکایت نہ کیجیے گا کہ غیر مانوس ناموں سے رعب ڈالتے ہیں، کیوں کہ دلیل اور ثبوت کا مطالبہ بھی قارئین کی طرف سے ہوتا ہے۔

یورپ اپنی دینی روایت سے ایسا بیگانہ ہوا ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ کے فلسفے اور ادب کو سمجھنا ان کے لیے تقریباً ناممکن ہوگیا ہے اور وہ ظن و تخمین سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ازمنۂ وسطیٰ کے ادب، یہاں تک کہ چوسر اور شیکسپیئر کے یہاں ایسے مسائل پیدا ہوتے ہیں جن کا مغرب کے نقاد کوئی معقول حل نہیں ڈھونڈ سکتے۔ شاید ڈھونڈنا بھی نہیں چاہتے۔ ہم لوگ انہیں عقل و حکمت کا پتلا سمجھا کریں، مگر میرے پاس پیرس یونی ورسٹی کے شعبۂ فلسفہ کے صدر کا مطبوعہ بیان موجود ہے کہ ٹامس اکوائناس کی کتابوں کا ترجمہ شائع کرنا کاغذ کا بے جا استعمال ہے۔ اس ذہنیت کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ جن کتابوں کی مدد سے مغرب کی فکری اور ادبی روایت کو (دراصل یوں کہنا چاہیے کہ روایتی فکر و ادب کو) سمجھا جاسکتا ہے۔ وہ نظروں سے پوشیدہ ہیں۔ مثلاً رچرڈ سیں وکٹر (Richard st Victor) کی چند کلیدی تصنیفات۔ ایک اور قریب کی مثال لیجیے۔ بیسویں صدی میں ایک فرانسیسی نے عیسوی علامتوں اور رموز کا صحیح مطلب دریافت کرنے کی کوشش کی تھی، مگر وہ مرگیا اور اس کی بیشتر کتابوں کو ناشر نہیں مل سکا۔ ان حالات میں مغرب کے روایتی ادب پر تسلی بخش تنقید ہو تو کیسے ہو؟ البتہ بعض لوگوں نے یہ راستہ نکالا ہے کہ یورپ کے روایتی ادب اور تہذیبی مظاہر، بلکہ

خود عیسائیت کے باطنی پہلو کو سمجھنے کے لیے ویدانت یا اسلام سے مدد لی جائے۔ اس معاملے میں اسلام اور خصوصاً تصوف زیادہ معاون ثابت ہوتا ہے۔ کیوں کہ ازمنۂ وسطیٰ میں یورپ نے اسلام کا بہت گہرا اثر قبول کیا ہے۔ مثلاً رچرڈ سیں وکتور ہی کی بعض کتابیں ہیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ تصوف کے زیر اثر لکھی گئی ہیں۔ تصوف کی مدد سے عیسائیت اور عیسوی تہذیب کا مطالعہ کرنے کا رجحان فرانس میں زیادہ ملتا ہے، اور سنا ہے کہ اب مشرقی یورپ کے ممالک میں بھی پھیلتا جارہا ہے۔

جہاں تک مغرب کی روایتی تہذیب اور ادب کا تعلق ہے، سب سے معرکہ آراء کتاب پیئر پوں سوا Pierre Ponsoye کی L'Islam et le Greal ہے۔ بادشاہ آرتھر اور اس کے بارہ سرداروں کے قصے ازمنۂ وسطیٰ کے ادب میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کتاب میں اسی نوعیت کے ایک قصے کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ یورپ کی روایتی تہذیب کو سمجھنے کا اب ایک ہی ذریعہ باقی رہ گیا ہے کہ اس کا مطالعہ اسلامی تصوف کی روشنی میں کیا جائے۔

ازمنۂ وسطیٰ کے ادب میں ایک بہت بڑا اور پیچیدہ مسئلہ بارہویں صدی کی اس شاعری کا ہے جو پرووانس کے علاقے میں نمودار ہوئی اور جس نے یورپ کو ''رومانی محبت'' کا تصور دیا ہے۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ محبت جسمانی ہے یا روحانی یا دونوں کا مجموعہ؟ اگر روحانی ہے تو پھر عیسائیت سے اس کا کیا رشتہ ہے؟ اس سوال کے مختلف اور متضاد جواب دیئے گئے ہیں اور بحث میں عربی شاعری کا ذکر بارہا آیا ہے لیکن ۶۵ء میں ایک کتاب انگریزی میں ہی شائع ہوئی ہے Medieval Latin and European Love Lyric مصنف ہیں Peter Drouke اس کتاب میں عربی اور فارسی شاعری کے حوالے سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ شاعری میں عشق حقیقی اور عشق مجازی کا ایک جگہ جمع ہونا ممکن ہے۔ حال ہی میں اس کتاب سے متعلق ایک بحث میں نے پڑھی ہے جس میں نقاد کو سب سے مشکل مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ انسانی محبت خدا کی محبت میں کیسے تبدیل ہوسکتی ہے؟

یہ تو تھی تمہید۔ اب واپس آیئے میرے اس دعوے کی طرف کہ مغربی ادب کو سمجھنے میں مولانا تھانویؒ کی کتابوں سے مدد ملتی ہے۔ عشق حقیقی اور عشق مجازی کے تعلق پر تصوف کی کتابوں میں بہت کچھ لکھا گیا ہے، لیکن مولانا تھانویؒ نے ایک نہایت ہی آسان اور عام فہم اسلوب اختیار کیا ہے۔ حضرت نے پہلے تو یہ وضاحت کردی ہے کہ ایک زمانے میں

عشق مجازی کو بھی سلوک میں ایک طریقے کے طور پر اختیار کیا گیا ہے، مگر آج کل طبیعتوں میں حرام سے بچنے کی فکر اور تقویٰ نہیں رہا، اس لیے یہ طریقہ بھی اب متروک ہے۔ اس کے بعد تصریح فرمائی ہے کہ نفس کے رذائل اور خصوصاً کبر کو جو سب رذائل کی جڑ ہے دور کرنے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ایک ایک کر کے دور کیا جائے۔ مگر اس کے لیے طویل عرصہ درکار ہے اور اکثر تو سرے سے کامیابی ہی نہیں ہوتی۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ چند لازمی شرائط اور پابندیوں کے ساتھ عشق مجازی ہو جس کے ذریعے کبر اور دوسرے رذائل ایک ساتھ فنا ہو جاتے ہیں۔ اب صرف ایک ہی کام رہ جاتا ہے کہ قلب کی توجہ مخلوق سے ہٹا کر حق کی طرف پھیر دی جائے۔ اس طرح سلوک آسان ہو جاتا ہے اور فنا حاصل کرنے میں دیر نہیں لگتی۔ غرض، مغربی ادب کے بھی اس طرح کے بیسیوں مسائل ہیں جو مولانا تھانویؒ کی کتابوں سے حل ہو سکتے ہیں۔''

حسن عسکری کی ان باتوں سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے مگر مولانا تھانوی واقعی ادب کا گہرا ادراک و عرفان رکھتے تھے اور ادبیات کی تفہیم کا ان کا جو معیار و منہاج تھا وہ نام نہاد ناقدوں سے بالکل مختلف تھا۔ مولانا تھانوی نے منصور حلاج کے کلام کی جو شرح لکھی ہے اس میں انہوں نے بقول ڈاکٹر محمد علی صدیقی شاعری کے 'بین السطوری مطالعہ' پر زور دیا ہے یعنی Intertexuality پر۔

حسن عسکری مولانا تھانوی کو اپنا ادبی رہنما بھی تسلیم کرتے تھے جس سے عسکری صاحب کے معترضین کی ایک بڑی تعداد پیدا ہو گئی تھی۔ جمال پانی پتی نے اپنے مضمون ''محمد حسن عسکری: نفی سے اثبات تک'' میں اسی حقیقت کو بے حجاب کیا ہے:

● ''مرکزی روایت کے اس تصور تک پہنچنے سے پہلے ان کے ذہنی اور روحانی سفر کا تعلق مغرب سے تھا، اس کے بعد مشرق سے ہو گیا۔ پہلے وہ مشرق کو مغرب کی آنکھ سے دیکھتے تھے، اب مغرب کو مشرق کی آنکھ سے دیکھنے لگے۔ پہلے جوئس، پاؤنڈ، لارنس، بودلیئر، فلوبیر اور میلارمے وغیرہ ان کے ہیرو تھے، اب رینے گینوں، ابن عربی، مجدد صاحب، مولانا اشرف علی تھانوی اور شاہ وہاج الدین وغیرہ نے ان کی جگہ لے لی۔ پہلے ان کا کہنا تھا کہ میں نے اردو ادب کے بارے میں اگر کوئی کام کی بات کی ہے تو صرف اس لیے کہ میں نے مغرب کے لوگوں سے چند امتیازات سیکھے ہیں، لیکن اب وہ مغربی ادب کو سمجھنے کے لیے بھی مولانا اشرف علی تھانوی کی کتابوں کو ضروری قرار دینے لگے۔ پہلے وہ جن معیاراتِ تنقید سے ادب کو دیکھتے تھے وہ مغربی ادب اور فکر سے مستعار تھے، اب

مشرق کے روایتی معیارات تنقید سے ادب کا جائزہ لینے لگے۔ یہی وہ بنیادی تبدیلی ہے جوان کے اندر رہتے گھنوں کے زیر اثر آنے کے بعد پیدا ہوئی اور جسے ان کے معترضین ادب کے حق میں نیک فال تصور نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک مولانا اشرف علی تھانوی اور شاہ وہاج الدین کی تحریروں سے ادبی تنقید کے اصول و معیار اخذ کرنا عسکری صاحب کے ذہن و فکر کے زوال کی علامت ہے بلکہ بعض لوگ تو ان اصولوں ہی کو مضحکہ خیز قرار دیتے ہیں۔ ان اصولوں میں خرابی کیا ہے یہ اصول و معیارات مضحکہ خیز کس بنا پر ہیں؟ یہ تو کوئی بھی نہیں بتاتا اور نہ بتا سکتا ہے۔ البتہ ان کی مضحکہ خیزی کی طرف ان کے اطلاقی نتائج کے اعتبار سے یہ کہہ کر اشارہ ضرور کیا جاتا ہے کہ لیجیے عسکری صاحب نے ذوق کو غالب سے بڑھا دیا یا داغ کو تصوف کا شاعر قرار دے دیا۔

عسکری صاحب نے شعروادب کی تنقید کے جو روایتی اصول و معیارات شاہ وہاج الدین یا مولانا اشرف علی تھانوی کے ہاں سے اخذ کیے، ان میں کوئی خرابی نہیں۔ ساری خرابی اس بات میں ہے کہ ذوق کے زمانے سے لے کر آج تک ہمارا طرز احساس اور مذاق سخن اس حد تک بدل چکا ہے کہ اب ہمارے لیے غالب کے مقابلے میں ذوق کو پسند کرنا کسی طرح بھی ممکن نہیں رہا، لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اگر کوئی شخص روایتی اصول نقد کے اعتبار سے ذوق کو غالب سے بہتر سمجھے یا داغ کے اس شعر:

صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں
خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں

کو تصوف کا شعر بتائے تو ہم اس شخص کی تنقیدی بصیرت کو زوال آمادہ اور روایتی معیارات نقد و نظر کو مضحکہ خیز قرار دینے لگیں۔ اس لیے کہ داغ کے اس شعر میں بھی وہ معنوی جہت ضرور موجود ہے جو کسی روایتی معیار نقد و نظر رکھنے والے آدمی کی نظر میں اس شعر کو ظہور و خفا کے مسئلے سے وابستہ کر کے تصوف کا شعر بنا سکتی ہے۔ داغ کے اس شعر میں یہ معنوی جہت خواہ شعوری طور پر نہ آئی ہو مگر غیر شعوری طور پر اسے ہماری تہذیب کی اس قدیم روایت کا فیض ضرور پہنچا تھا جس کی بنا پر یہ شعر بہ یک وقت عشق مجازی اور عشق حقیقی کی دونوں جہتوں کا آئینہ دار بن گیا۔"

جمال پانی پتی نے اس چشم کشا حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا ہے جس سے ہمیں یہ سمجھنے میں سہولت حاصل ہوگی کہ ہمارا طرز احساس اس قدر بدل گیا ہے کہ ہم شیشہ گران فرنگ کے احسان اٹھائے

پھرتے ہیں اور سفال ہند کو حقیر شے تصور کرتے ہیں۔ بہر حال مولانا تھانوی کا تنقیدی شعور بالیدہ تھا اور ان کے اندر وہ تنقیدی بصیرت تھی جو تخلیقی فن پاروں کو اچھی طرح بالقسط پرکھ سکتی تھی۔

مولانا اشرف علی تھانوی کا اسلوب اور ان کا نثری نظام بھی دوسروں سے مختلف تھا۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے ایک مضمون میں ابوالکلام آزاد کی اسلوب جلیل والی نثر سے مولانا تھانوی کے اسلوب کا تقابل کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مولانا اشرف علی تھانوی کا اسلوب خطیبانہ نہیں بلکہ موعظت اور تلقین کا ہے۔ وہ موقع محل کے اعتبار سے نہایت آسان یا نہایت مشکل اور معرب زبان استعمال کرتے ہیں۔ ضرورت ہو تو وہ لطیفے، حکایات اور چٹکلے بھی بیان کرتے ہیں اور جب باریک مسائل پر آجاتے ہیں تو ان کی زبان اس قدر مشکل ہو جاتی ہے کہ ہم جیسوں کو اسے کئی بار پڑھنا پڑتا ہے۔ ابوالکلام آزاد کی نثر کا سلسلہ بھی اسی طرح مختلف انتہاؤں کو محیط ہے — مولانا ابوالکلام کی نثر بعض بہترین روایتوں کی امین ہے لیکن اس کا استعمال وہ غلط طریقے سے کرتے ہیں۔ مولانا شاہ اشرف علی تھانوی مشکل زبان استعمال کرتے ہیں اس لیے کہ وہ کوئی ادق یا باریک بات کہہ رہے ہیں۔ ابوالکلام آزاد مشکل زبان استعمال کرتے ہیں صرف طبیعت کا جوش اور مزاج کا تلاطم ظاہر کرنے کے لیے۔''

مولانا تھانوی کی نثر میں جمال و جلال کا پرکیف امتزاج ملتا ہے۔ ان کا اسلوبی نثری نظام ہمارے عام اردو مصنفین سے بہت مختلف ہے۔ ماہرین اسلوبیات اور ساختیات مولانا تھانوی کے نثری اسالیب سے ادب کے بہت سارے مسائل کو سمجھنے میں مدد حاصل کر سکتے ہیں۔ ان کی نثر اچھی نثر تھی۔ پیچ در پیچ مغلق اور مبہم نہیں ہے۔ وہ ایسی نثر تھی جو شاعری کی طرح سیدھے دل میں اُتر جاتی تھی۔ ان کا نثری اسلوب ہمارے لیے یقیناً ایک نمونہ اور نظیر بھی ہے۔ ان کے ایک ایک لفظ میں جہاں معنی پوشیدہ ہے... وہ ایسی ترسیلی نثر لکھتے تھے جس میں معارف علوم کا دریا لہریں مارتا تھا۔ وہ غیر ضروری اطناب سے انحراف کرتے تھے اور ایجاز و اختصار کے ساتھ باتیں کرتے تھے۔

کوئی مانے یا نہ مانے، میری بلا سے، بہشتی زیور والے مولانا تھانوی جو صاحب تصانیف کثیرہ ہیں، اردو ادب کے گہرے رمز شناس تھے اور صاحب اسالیب نثر نگار، بہترین ادبی پارکھ اور نقاد بھی۔ ان کی تنقیدی بصیرت کو کوئی اخفش ہی نکارنے کی حماقت آمیز جرأت کر سکتا ہے۔ کم از کم میری بساط تو نہیں ہے کہ میں ان کے گہرے تنقیدی شعور پر ایک ''حرف غلط'' بھی رکھ سکوں۔

○○○

علامہ تاجور نجیب آبادی کی تنقیدی تخلیقی حرکیات

اُردو تنقید کے بنیادی خدوخال عربی اور فارسی تنقید سے لیے گئے ہیں۔ اُردو کے ابتدائی دور کے ناقدین نے ابن رشیق اور ابوہلال عسکری کے تنقیدی نظریات سے خاطر خواہ استفادہ کیا ہے، پھر مغربی تنقیدی افکار ونظریات نے اُردو تنقید کو وسعت، تازگی، معقولیت اور شگفتگی عطا کی۔ اس طرح اردو تنقید نے مختلف رنگ و پیرہن بدلے اور متعدد نوع کی تنقیدیں وجود میں آئیں۔ اس طرح اُردو تنقید کا ارتقائی سفر جاری ہے۔ اردو کے ناقدین، ادب میں بہتر اور عمدہ تجربے کر رہے ہیں۔

اُردو ادب وتنقید کا ایک اہم نام علامہ تاجور نجیب آبادی بھی ہے، ان کا تعلق دیوبند کے عربی مدرسے سے رہا ہے جہاں معقولات ومنقولات کی تعلیم وتدریس ہوتی ہے مگر تاجور نجیب آبادی نے ابتداء سے ہی ادب سے عملی دلچسپی برقرار رکھی اور یہ اتنی بڑھی کہ ''ادبی آدمی'' بن کر رہ گئے۔ مختلف مقتدر مجلّات کی ترتیب وادارت کے فرائض انجام دیے اور اس خوبی کے ساتھ کہ مشاہیر ادباء نے ان کے مرتب کردہ مجلّات کو اردو کی صحافتی تاریخ میں سنگِ میل قرار دیا، ان کے رسالوں کو ادبی دستاویز کی حیثیت حاصل ہوئی۔ تاجور نے طویل مدت تک ادبی جدوجہد کی، معاندین ومخالفین سے برسرِ پیکار رہے اور ادب کی خدمت کے نام پر اپنا ذاتی اثاثہ بھی وقف کر دیا۔ یہ تھا ان کا ادبی خلوص اور اس سے محبت کی انتہا مگر تاریخ ادب کی یہ ستم ظریفی ہے کہ ایسے مخلص ادیب کو فراموش کر دیا جس کی ذات سے آج بھی کئی ادبی انجمنیں روشن ہیں اور جن کے تربیت یافتہ شاگردوں کی ایک بڑی تعداد ادب کی خدمت تجی لگن، محنت کے ساتھ کر رہی ہے۔

تاجور نے گوکہ باضابطہ تنقید نگاری کا فرض انجام نہیں دیا مگر مختلف مجلّات میں شائع شدہ

مضامین سے ان کے تنقیدی تصورات پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ اپنے تنقیدی و ادبی تاثرات کا مستقل اظہار کرتے رہے، یہی تاثرات ان کے تنقیدی شعور اور رویے کی وضاحت کرتے ہیں۔ مشرقی نقد روایت کا پورا وسیع منظرنامہ ان کے سامنے تھا اور سنسکرت و ہندی کی ادبی روایت پر بھی ان کی گہری نگاہ تھی مگر تاجور کا بنیادی مقصد ادب و زبان کی ترویج و اشاعت تھا۔ اس لیے فن پارے کے حسن و قبح پر نظر رکھتے ہوئے اور تجزیے کی تمام تر صلاحیتوں کے باوجود انہوں نے نقد ادب میں ترغیب و تشویق، تشجیع و تکریم کا طور اپنایا تھا۔

علامہ تاجور کا ایک اہم تنقیدی مضمون ''حریفانِ بزم ادب'' ہے جس میں میر تقی میر اور مرزا محمد رفیع سودا کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ دونوں ممتاز شاعروں کے مزاجوں کے تفاوت اور شاعری پر اس کے پڑنے والے اثرات کا جائزہ لیا ہے، یہ مضمون اس لحاظ سے اہم ہے کہ علامہ تاجور نے مختلف ناقدین ادب کی رایوں کی مدلّل و مبرہن تغلیط بھی کی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''وسعتِ بیان اور زورِ کلام کے اعتبار سے اُردو زبان اور اُردو شاعری کو سرمایہ دار بنانے میں جن باکمال شعراء نے نمایاں حصہ لیا، ان میں میر تقی میر اور مرزا رفیع سودا کا نام بہت ممتاز ہے، سچ تو یہ ہے کہ اُردو شاعری کو صحیح معنوں میں شاعری کہلانے کا فخر زیادہ تر ان ہی دونوں بزرگوں کی بدولت نصیب ہوا۔ ان سے پہلے اُردو شاعری زیادہ تر غزلوں اور کچھ حد تک مثنویوں پر مشتمل تھی۔ اُنہوں نے قصیدہ، سلام، مرثیہ، رُباعی، مخمس، مسدس، مستزاد وغیرہ اکثر اصنافِ سخن میں قادر الکلامی کے جوہر دکھائے اور اپنے جانشینوں کے لیے طبع آزمائی کی نئی نئی شاہراہیں کھول دیں۔ میرے نزدیک مختلف شعراء کے کلام کو موازنہ و مقابلہ کا مضمون بنانے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ ان کے ذاتی یا معاصرانہ تعلقات میں کشیدگی کے ثبوت تلاش کیے جائیں۔ اہل کمال کی باہمی دوستی یا مخالفت اور چیز ہے اور ان کے کمال کا مقابلہ اور چیز۔ موزانہ اشعار، دماغی تفریح کے علاوہ مذاق شعر کی صحیح تربیت کا بھی ایک عمدہ ذریعہ ہے۔ میر اور مرزا کا موازنہ کرنے سے پیشتر دونوں اُستادوں کی اُفتادِ طبع کا فرق بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ صاحب آبِ حیات نے متعدد ایسے واقعات بھی درج کیے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر صاحب کی بے دماغی حدِ انتہا تک پہنچی ہوئی تھی۔ بادشاہ کی سواری سامنے آئی تو سب لوگ تعظیماً کھڑے ہوئے مگر یہ اسی طرح بیٹھے رہے۔ شہر کے عمائد و اراکین جمع ہو کر ان کی خدمت میں گئے اور اشعار کی فرمائش کی تو صاف کہہ دیا کہ

میرے اشعار آپ کی سمجھ میں نہیں آنے کے۔ گورنر جنرل یا انگریزی حکومت کا کوئی جلیل القدر عہدے دار لکھنؤ آتا اور اس تقریب پر میر صاحب کو بلایا جاتا تو ہمیشہ پہلو تہی کرتے اور کہتے کہ مجھ سے جو کوئی ملتا ہے تو یہ مجھ فقیر کے خاندان کے خیال سے یا میرے کلام کے سبب سے ملتا ہے، صاحب کو خاندان سے غرض نہیں، میرا کلام سمجھتے نہیں البتہ کچھ انعام دیں گے، ایسی ملاقات میں ذلت کے سوا کیا حاصل۔ اور تو اور کسی کو اصلاح دینا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ میر قمر الدین منت، مرزا سعادت یار خاں رنگین اور شیخ امام بخش ناسخ جو بعد کو مسلم الثبوت اُستاد ہوئے، ان کو بھی شاگردی میں قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ بڑی مصیبت یہ تھی کہ ان کا انکار معذرت آمیز کیا معمولی پیرائے میں بھی نہیں ہوتا تھا بلکہ اس سے سخت دل شکنی اور دل آزاری کا پہلو نکلتا تھا، کسی سے کہہ دیتے تھے کہ اردو خاص دلی کی زبان ہے، آپ اس میں تکلیف نہ کیجیے۔ اپنی فارسی وارسی کہہ لیا کیجیے اور کسی کو یہ ارشاد ہوتا کہ آپ کی طبیعت اس فن کے مناسب نہیں۔ یہ آپ کو نہیں آنے کا، خواہ مخواہ میری اور اپنی اوقات ضائع کرنی کیا ضروری ہے۔''

تاجور کے اس اقتباس سے جہاں میر کی شاعرانہ انانیت پر روشنی پڑتی ہے اور ان کی مخصوص اُفتادِ طبع کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہیں مرزا سودا کا ذہن و مزاج ان سے بالکل متخالف و متضاد ہے۔ دونوں کے نظریے اور رویئے میں گہرا تباین و تغایر ہے۔ زندگی کو برتنے کا الگ الگ طریقہ ہے، میر اُداس طبیعت کے ہیں تو مرزا میں شگفتہ مزاجی پائی جاتی ہے۔ دونوں کی متضاد طبیعتوں کی تصویر کشی تاجور کی زبان میں دیکھئے:

> ''جہاں مرزا کی غیرت، وضع داری تک محدود تھی، وہاں میر کی حمیت نازک مزاجی اور بے دماغی آخری حد تک پہنچ چکی تھی۔ مرزا غیور اور باحمیت ہونے کے ساتھ ہی زندہ دل اور شگفتہ مزاج بھی تھے، مگر میر صاحب کے دل کی کلی کبھی نہیں کھلتی تھی۔ مرزا دنیا اور دنیا کی نعمتوں کا لطف اُٹھاتے تھے، میر صاحب دنیا میں رہتے تھے مگر دنیا والوں سے بے نیاز ہو کر اور ان کی یہ بے نیازی بیزاری کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ مرزا دنیا کو ناموافق دیکھتے تھے تو دنیا والوں سے اُلجھ پڑتے تھے — میر صاحب نفرت کی ایک نگاہ ڈالتے تھے اور منہ پھیر لیتے تھے۔ میر اور مرزا میں ایک اور فرق یہ تھا کہ میر صاحب عشق کے زخم خوردہ تھے، ان کے والد بہت بڑے درویش تھے، میر صاحب کو ان کی تلقین بھی ہمیشہ درویشانہ اور صوفیانہ رنگ میں ہوتی تھی اور اس میں وہ خاص کر عشق

اختیار کرنے کی تاکید فرماتے تھے: ''بیٹا عشق اختیار کرو کہ عشق ہی اس کارخانہ (دنیا) پر مسلط ہے، اگر عشق نہ ہوتا تو یہ تمام نظام درہم برہم ہو جاتا، بے عشق کی زندگی وبال ہے اور عشق میں دل کھونا اصل کمال ہے، عالم میں جو کچھ ہے وہ عشق ہی کا ظہور ہے۔ ایسے پھول کے بلبل بنو جو سدابہار ہو۔'' جس بچے کے کان میں دن رات یہی آوازیں پڑتی رہیں، وہ ناممکن ہے کہ سن شعور کو پہنچنے سے پہلے ہی تیرِ عشق کا گھائل نہ ہو جائے۔ اس کے مقابلے میں سوداؔ کو عشق سے اتنا ہی تعلق ہے جتنا ایک وکیل کو اپنے موکل کے مقدمے سے ہوتا ہے۔''

دونوں ممتاز شاعروں کی اُفتادِ طبع کا جائزہ لینے کے بعد تاجورؔ نے لکھا ہے کہ اس کا گہرا اثر ان دونوں کی شاعری پر پڑا ہے۔ میرؔ نے جس انداز سے دُنیا کو دیکھا اور پرکھا، اسی کو شاعری میں ڈھال دیا، سوداؔ نے جو نظریہ اپنایا، شاعری اس کی عکاسی کرتی ہے۔ سوداؔ کے کلام میں خارجیت کا عنصر نمایاں ہے تو میرؔ کے ہاں داخلیت ملتی ہے مگر دونوں ہی فنی اعتبار سے بلندی پر ہیں۔ علامہ تاجورؔ فرماتے ہیں:

''اس فرق سے جو دونوں اُستادوں کی اُفتادِ طبع میں واقع ہوا تھا، ان کی شاعری بھی متاثر نظر آتی ہے۔ سوداؔ کی نظر وسیع ہے، وہ دنیا اور دُنیا کی چیزوں کو شوق اور تحقیق کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اس لیے ان کے کلام میں خارجی مضامین کی کثرت پائی جاتی ہے۔ جوشِ بیانی اور بلند پروازی ان کی ممتاز خصوصیات ہیں۔ میر صاحب صرف اپنی دنیا میں رہتے ہیں، انہیں نہ صرف درباداری اور امراء کی ملاقات سے نفرت ہے بلکہ وہ اپنے اردگرد کی چیزوں کو دیکھنے کے لیے بھی نظر اٹھانے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ اس لیے ان کا کلام داخلی مضامین سے لبریز ہے۔ سوز و گداز اور سادگی و سلاست نے اس میں قیامت کی تاثیر پیدا کر دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے قصیدوں کی وہ شان نہیں جو غزلوں اور مثنویوں کی ہے۔ قصیدے کے لوازمات ہیں شکوہِ الفاظ اور بلندیٔ مضامین۔ یہ چیزیں میرؔ کے یہاں بہت کم ہیں۔ اس کے علاوہ طبعی قناعت اور دنیا سے بیزاری کے باعث وہ امراء کی مداحی سے بے نیاز تھے اور صلہ کی اُمید پر یا ازراہِ شکریہ کسی کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملانا ان کی فطرت کے منافی تھا۔ میرؔ اور سوداؔ کے متعلق عام طور پر جو رائے ظاہر کی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ قصیدے میں میرؔ کو سوداؔ سے اور مثنوی میں سوداؔ کو میرؔ سے کوئی نسبت نہیں۔ میں ان دونوں کے قصیدوں اور مثنویوں کو دیکھ کر اس رائے پر پہنچا ہوں کہ قصیدے میں سوداؔ کو میرؔ پر تفوق ہے اور

مثنوی میں میر، سودا سے بازی لے گئے ہیں۔ یہ تفوق اور برتری ''کوئی نسبت نہیں'' کی حد تک نہیں پہنچتی بلکہ زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس کا تفاوت باہمی تفوق میں حائل ہے۔ میں قصائد اور مثنویوں کو موازنہ کا موضوع نہیں بناتا اور صرف غزلوں کے مقابلے پر اکتفا کرتا ہوں کہ اس صنف میں دونوں استاد اپنی اپنی جگہ صاحب طرز ہیں۔ بعض نقادوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ قصیدہ میں سودا میر سے اور غزل میں میر سودا سے برتر ہیں اور سودا کی غزل سست ہوتی ہے اور میر کا قصیدہ سست ہوتا ہے۔ لیکن مولانا علی حیدر نظم طباطبائی نے دیوانِ غالب کی شرح میں اس خیال کی تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ ''یہ بات حدِ تحقیق سے دور ہے۔ سودا کی غزلیں بھی ہرگز سست نہیں۔ البتہ میر سے غزلیں انہوں نے کم کہی ہیں اور قصائد بہت کہے ہیں'' نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ جو بلند پایہ سخن سنج ہونے کے ساتھ ہی اعلیٰ درجے کے سخن فہم بھی تھے، اپنے تذکرہ گلشن بے خار میں سودا کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''عوام میں جو یہ مشہور ہے کہ ان کا قصیدہ غزل سے بہتر ہوتا ہے، میرے نزدیک ایک مہمل بات ہے۔ میرے خیال میں ان کی غزل قصیدہ سے بہتر ہوتی ہے اور قصیدہ غزل سے بہتر ہوتا ہے۔'' آزاد نے تذکرہ ''آبِ حیات'' میں پونے تین شاعروں والا جو قصہ بیان کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سودا کے کمال کا اعتراف خود میر صاحب کو بھی تھا۔ اس قصہ کے مطابق لکھنؤ میں کسی نے میر صاحب سے پوچھا کہ حضرت آج کل شاعر کون کون ہے۔ میر صاحب نے جواب دیا کہ ایک سودا اور ایک یہ خاکسار پھر کچھ تامل کے بعد کہا، آدھے خواجہ میر درد اور سوز کو بڑی مشکل سے پاؤ شاعر تسلیم کرنے کے بعد فتویٰ دیا کہ اس طرح پونے تین شاعر ہوتے ہیں — ظاہر ہے کہ میر صاحب صرف قصیدہ کی بناء پر جس سے ان کو ازلی رغبت ہی نہیں تھی، اس حد تک سودا کے معترف نہیں ہو سکتے۔''

یہ مضمون ''تقابلی تنقید'' کی ایک بہترین مثال ہے اور تقابلی مطالعہ کے لیے علوم وفنون کے استحضار اور ادبیات سے آگہی کی ضرورت پڑتی ہے۔ تقابلی مطالعہ کے جو لوازم ہیں، تاجور نجیب آبادی کا ذہن ان سے معمور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید کسی نوع کے تذبذب کی شکار نہیں ہوئی۔

علامہ تاجور نجیب آبادی (۱۸۹۳-۱۹۵۱) نے اپنے رسالہ ''ادبی دنیا'' لاہور میں ''تنقیدِ شعری'' کے عنوان سے ایک نہایت اہم سلسلے کا آغاز کیا تھا جس کا بنیادی مقصد ان کے خیال میں یہ

تھا کہ ملک کے نوجوانوں میں صحیح ذوقِ شعر پیدا کیا جائے اور ان کو اس بات سے آشنا کیا جائے کہ آرٹسٹ اپنی تخلیقات کو کیسے نادر معانی سے لبریز کر دیتا ہے کہ عام طور پر نوجوان شعر کو ''تفریح'' خیال کرتے ہیں ان کو یہ خیال نہیں آتا کہ اچھے شعر کے الفاظ و تراکیب اپنی خیال آفرینی کے اعتبار سے بےنظیر ہوتے ہیں۔ ان میں یہ قوت ہوتی ہے کہ پڑھنے والے کے دل میں ایک سلسلہ خیال پیدا کر دیں۔'' (ادبی دنیا لاہور، نومبر، ۱۹۳۰) اس سلسلے میں انہوں نے تشریحی تنقید یا متنی نقد کو خاصا فروغ دیا۔ اب علم شرح اور تعبیر متن کے حوالے سے جو نئی تنقیدی بحث چھڑی ہے، یہ سلسلہ اس کا ایک نقطہ آغاز ہے۔ اُردو کے ممتاز ناقد جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے ''شعر شور انگیز'' اور ''تفہیم غالب'' کے ذریعے جو خدمت انجام دی ہے اور اشعار میں مضمر حقائق و مدرکات کی جو تفسیر و تعبیر کی ہے۔ تاجور نے بہت پہلے اس کا آغاز کیا تھا — ان کی ''تشریحی تنقید'' کا عمدہ نمونہ ملاحظہ کیجیے:

ساری دنیا کے ہیں وہ میرے سوا
میں نے دُنیا چھوڑ دی جن کے لیے
— امیر مینائی

''یہ شعر عبرت عشق کی تصویر اور محبت کا ایک دردناک مرقع نظر کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ اسلوبِ بیان کی اثر خیز سادگی، درد ریز اصلیت، زبان کی سلاست، الفاظ کی فصاحت اور وہ خوبیاں جو کسی شعر کو سحر بنا دیتی ہیں، اس شعر میں موجود ہیں۔ اصل مفہوم تو صرف اس قدر ہے کہ ہم نے ان کی خاطر دوسروں کو چھوڑ دیا اور وہ ہمیں چھوڑ کر انہیں سے جا ملے لیکن اس مفہوم کو ادا کرنے میں اسلوبِ بیان کے سوا الفاظ کے بہترین انتخاب میں شاعر قابلِ رشک حد تک کامیاب ہوا ہے اگر وہ ساری دُنیا کے الفاظ کے بجائے یہ کہتا کہ محبوب ان اغیار سے جا ملا جن سے ہم نے اس کی خاطر بگاڑ کی تھی تو شعریت اس پست سطح پر گر کر چکنا چور ہو جاتی حالانکہ یہ ''ساری دنیا'' محدود اب بھی اغیار ہی تک ہے۔ لیکن شاعر اغیار کا ذکر نہیں کرتا بلکہ انہیں ''ساری دنیا'' سے تعبیر کر کے دوست کے ہرجائی ہونے پر تعریض کرتا ہے اور اپنی بے کسی اور مظلومی کو ''ساری دنیا'' کے الفاظ سے زیادہ دردناک بناتا ہے۔ گویا دوسرے لفظوں میں یہ کہتا ہے کہ دوست نے دنیا کے ہر کس و ناکس کو اپنا بنا لیا ہے مگر وائے محرومی کہ ایک میں ہی اس کے لطفِ نگاہ سے محروم ہوں حالانکہ اپنے پرائے، بیگانے، عزیز و اقارب مختصر یہ کہ میں نے اپنی دنیا اس سے ملنے کی خاطر قربان کر دی۔ ''دنیا چھوڑ دی'' شاعر

کی یہ دنیا بھی اس کے حلقہ تعارف تک محدود ہے لیکن اگر وہ ''دنیا چھوڑ دی'' کے بجائے عزیز و اقارب کے چھوڑنے کا ذکر کرتا تو پھر بھی یہ شعر سطحی اور بے اثر ہو جاتا۔ ''میرے سوا'' اس استثنا نے محبت کے انجام کو آئینہ دارِ عبرت بنا دیا ہے گویا محبت کے سرمائے میں محرومی و مظلومی کے سوا اور کچھ نہیں ہے ''جن کے لیے'' ایک تارکِ دنیا یوں بھی سب کی نگاہوں میں عزیز ہوتا ہے کہ دُنیا سے جو بیگانہ ہو جائے، اہلِ دنیا اُسے اپنانے کے لیے آرزومند رہا کرتے ہیں لیکن جب صورت یہ ہو کہ دنیا کسی خاص شخص کے لیے چھوڑ دی جائے اور ساری دنیا سے منہ موڑ کر صرف اسی کو اپنی دُنیا بنا لیا جائے، ایسی صورت میں اگر وہ شخص اپنے اس فدا کار کو نظر انداز کر دے تو اس سے زیادہ سنگدلی، بے ہمتی اور کیا ہو سکتی ہے۔ پھر یہ سنگدلی حدِ برداشت سے تجاوز کر جاتی ہے۔ اگر وہ شخص اسے چھوڑ کر باقی ہر کس و ناکس سے ملنا جُلنا شروع کر دے۔ شعر مذکور میں ''جن کے لیے'' کا لفظ محبوب کی بے ہمتی اور عاشق کی بے نصیبی کے نقطۂ عروج کو واضح کر رہا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ شعر زبان و بیان کی خوبیوں کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے اور کوئی مبالغہ نہ ہوگا اگر اسے سہل ممتنع قرار دیا جائے۔''

(''ادبی دنیا'' لاہور مئی ۱۹۳۱)

امیر مینائی کے شعر کی علامہ تاجور نے بہت جامع و مانع تشریح تفسیر کی ہے اور تمام نکتوں کو واضح کیا ہے۔ اس سے تاجور کی گہری تنقیدی بصیرت اور عمیق ادبی لسانی شعور کا پتہ چلتا ہے۔ غرضیکہ تاجور صرف ''مخزن''، ''ادبی دنیا'' اور ''شاہ کار'' کے مدیر ہی نہیں تھے بلکہ ایک ناقد اور ہمہ جہت علم رکھنے والے ادیب بھی تھے جو ادب میں افادیت و مقصدیت کے حامی اور صحت مند اخلاقی اقدار کے فروغ کے قائل تھے۔ سعادت حسن منٹو (جو بی۔ اے میں تاجور کے شاگرد بھی تھے) کے افسانے ''ٹھنڈا گوشت'' پر ان کی یہ رائے کہ ''میری چالیس سالہ ادبی زندگی میں ایسا ذلیل اور گندا مضمون میری نظر سے نہیں گزرا'' ان کے اسی طاہر مطہر ادب کی تشکیل کا غماز ہے۔

تاجور کے صحافتی امتیازات

علامہ تاجور نجیب آبادی ان چند شخصیتوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے اپنی پوری زندگی ادب کے لیے وقف کر دی مگر پھر بھی ادبی دنیا کے لیے اجنبی ٹھہرے۔ ادب کے مورخ نے بھی انہیں بھلا دیا اور اردو کی نئی نسل بھی ان سے آشنا نہیں، صرف خاصانِ ادب ہی ان کی ادبی خدمت سے واقف

ہیں اور کبھی کبھی اپنی ادبی فرض شناسی کے طور پر اپنا قرض بھی اتار دیتے ہیں۔۔۔ن۔م راشد، اختر شیرانی، احسان دانش، قیوم نظر، جگن ناتھ آزاد کو کون نہیں جانتا مگر واقف نہیں تو صرف ان سے جنھوں نے ان لوگوں کو جوہر قابل بنایا۔مخزن، ادبی دنیا، شاہکار، ہمایوں جیسے مقتدر رسالوں سے ادیبوں اور شاعروں کو شہرت کی بلندی پر پہنچانے والا اردو کا جواں ہمت بزرگ خادم تاریکیوں میں کھو جائے گا، یہ کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔اردو کے ایسے عاشق سرشار بھلا دیئے جائیں، یہ اردو دنیا کے لیے انتہائی افسوسناک امر ہے۔تاجور نے یہ سچ کہا تھا:

''متعدد اصنافِ ادب میں بیسیوں شاگردوں کو آسمانِ شہرت پر پہنچا دیا لیکن ماہناموں کے صفحات سے اردو نثر کی تاریخ مرتب کرنے والے ان تابناک ستاروں کے مبدأ نور سے بے خبر بن رہے ہیں۔ادھر جس ادبی فضا میں زندگی کے ۲۵ سال بسر کر چکا ہوں، وہ میرے لیے اس لئے ناسازگار چلی آتی ہے کہ میں تمہارے تنبیہ کے اس پار کیوں پیدا ہوا۔''

تاجور نے شاعری کی تنقید لکھی، انجمن ارباب علم قائم کرکے ادب کا باذوق حلقہ پیدا کیا۔اردو مرکز قائم کیا جس کے کارکنندگان میں سیماب اکبرآبادی، جگر مرادآبادی، اصغر گونڈوی، شبیر علی خان جوش، منوہر سہائے انور، عابد علی عابد، مولانا حامد علی خان، سردار اودھے سنگھ، شائق جیسے مشاہیر شامل تھے۔پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں میں اردو کو مقبول بنایا اور گوپال متل کے بقول ''شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد کے بعد اردو کی ترویج میں غالباً سب سے زیادہ انہیں کا حصہ ہے۔'' غرض اردو دنیا کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔اپنا ذاتی اثاثہ صرف کیا۔بیگم کے زیورات فروخت کرکے ادبی رسالے نکالے۔خود تاجور نے ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے نام ایک مکتوب میں لکھا ہے کہ:

''یہاں (لاہور میں) بیس سال سے اردو ادب کی رہنمایانہ خدمت کررہا ہوں اور اس راہ میں بیس ہزار ذاتی سرمایہ کے علاوہ جوانی، دماغ، طاقت سب کچھ لٹا چکا ہوں۔ نوجوان ادبا شعراء کا مذاق بلند کرنے میں میرا سب سے زیادہ حصہ ہے۔اس شعراء و ادباء کے جدید طبقے میں ہندوستان گیر شہرت کے میرے شاگرد اخبار نویسی تنقید نگاری، ڈرامانویسی، تصنیف وتالیف کے ذریعہ خدمت زبان کررہے ہیں۔''

یہی بات پروفیسر عبدالصمد، صارم ازہری فاضل دیوبند نے بھی لکھی ہے:

''تاجور نجیب آبادی کی جہاں بے شمار خدمات ہیں، ان میں مرحوم کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اس ایک واحد شخص نے ہندوؤں اور سکھوں میں اردو کو مقبول بنایا۔

پنجاب میں اردو کی ترویج میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کے علاوہ سیکڑوں ہندو، سکھ، شاعر، ایڈیٹر، مضمون نگار، افسانہ اور ڈرامہ نویس پیدا کئے اور سیکڑوں رسالوں کی ایڈیٹری کی— تلوک چند محروم اور موہن سنگھ دیوا کر جیسے بھی ان سے اصلاح لیتے تھے۔ انہوں نے ہزاروں اردو ٹیچر اور پروفیسر پیدا کئے۔''

تاجور کو اردو سے اس درجہ تعلق ومحبت ہے کہ ممتاز محقق قاضی عبدالودود نے بھی یہ اعتراف کیا ہے کہ ''اردو سے انہیں جو محبت ہے۔ وہ مصلحت اندیشی کے حدود سے بہت آگے بڑھی ہوئی ہے اور اس کے لیے ہر قسم کی قربانی کے واسطے تیار رہتے ہیں۔ 'ادبی دنیا' نکال کر انہیں سخت نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو عمر بھر کے لیے اس شغل سے باز آجاتا۔'' مگر اردو والوں نے اس درجہ محبت کا خوب صلہ دیا... علامہ تاجور کی زندگی میں بھی علم وفن سے ناواقف مدعیان علم وفن، مذاق سخن سے عاری ناقدان سخن نے ان کے خلاف باقاعدہ محاذ بنالیا مگر وہ چوکھی لڑتے ہوئے اس دنیا سے گزر گئے۔ موانعات کے باوجود آدم زاد بھیڑیوں کے ہجوم میں بھی ادب وصحافت کا چراغ روشن کئے رہے۔ اس کا احساس رسالے کے ڈائرکٹر سرعبدالقادر کو بھی تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''میرے خیال میں مولانا تاجور اردو، اردو زبان اور ادب اردو کے شائقین کے دلی شکریے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ہر طرح کی تکالیف اٹھا کر اور کافی قربانیاں کر کے ایسا بیش بہا رسالہ جاری کیا جو اپنی ادبی خدمات اور ظاہری شان کے لحاظ سے موجودہ رسائل کی صف اول میں ممتاز ہے۔''

معاندین اور مخالفین کے حسد اور نامساعد حالات کے باوجود جو بھی رسالہ نکالا، اس شان سے کہ معاصر ادبی مجلات کو پیچھے چھوڑ دیا۔ ان کے رسالے ''ادبی دنیا'' نے تو اتنی شہرت ومقبولیت حاصل کی کہ بقول تاجور ''تمام ملک نے اسے صحافت کے لیے نشان راہ تسلیم کیا۔ اس کی مانگ دنیا کے ہر اس منطقے میں تھی جہاں ہندوستانی پہنچ چکے ہیں۔'' اسے نواب مسعود جنگ بہادر، ڈاکٹر سید راس مسعود وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بھی اردو کے ممتاز رسالوں میں تصور کرتے تھے اور نہایت ہی دلچسپی کے ساتھ پڑھتے تھے۔ اردو کے ایک محقق ڈاکٹر عبدالستار صدیقی پروفیسر الٰہ آباد یونیورسٹی کی رائے دیکھئے۔ اندازہ ہوگا کہ علامہ تاجور اردو کے کیسے عاشق سرشار تھے۔ لکھتے ہیں:

> ''مولانا تاجور، جو برسوں سے لگاتار اردو کی خدمت میں ان تھک کوششیں کر رہے ہیں۔ اس کے مدیر ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت تاجور اردو کے عاشق ہیں۔ مگر عاشق زار نہیں نہ عاشق بیمار— ہاں عاشق سرشار کہئے کہ محبت کا نشہ اس درجہ کا ہے کہ

اس کی ترنگ میں ناکامیوں پر قہقہے اڑاتے، موانع کو داہنے بائیں دھکیاتے، ترقی کے میدان میں آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔''

اسی طرح عربی کے ممتاز محقق پروفیسر زبیر احمد کی یہ رائے ملاحظہ کیجیے اور دیگر ادبی مجلات سے ''ادبی دنیا'' کے ادبی امتیازات پر غور کیجیے— ''جس آن بان کے ساتھ رسالہ ''ادبی دنیا'' نکل رہا ہے میرے نزدیک وہ کسی اردو پرچے کو نصیب نہیں۔ یہ نہ تو رسالہ ''معارف'' (اعظم گڑھ) کی طرح اول سے آخر تک علمیہ مضامین سے گرانبار ہے اور نہ دیگر عام پرچوں کی طرح قصوں، افسانوں اور نام نہاد ''ادب لطیف'' کی سحر طرازیوں کی بدولت سبک مایہ ہے۔''

یہ قصہ صرف ''ادبی دنیا' پر ہی ختم نہیں ہو جاتا ہے۔ بلکہ ''ہمایوں' اور'' شاہکار'' بھی اسی پائے کے رسالے تھے اور ادباء نے ان رسالوں کی بھی ستائش کی۔ میاں بشیر احمد بار ایٹ لا کے رسالے ہمایوں کے سرورق پر تو تاجور کا یہ شعر درج رہتا تھا:

سلطان تاجور درنکتہ سنجان آمد
لقال اللہ ہمایوں دیوگیر و دیوبند آمد

تاجور کی تخلیقی جمالیت

تاجور نے اردو میں بہت ہی عمدہ شاعری کی، حضرت رسا رام پوری کے شاگرد تاجور لفظوں کو بدلنے کا ہنر جانتے تھے۔ اس لیے شاگردوں کو بھی اس کی تلقین کرتے تھے۔ شاکر صدیقی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''تخیل لاکھ اچھا ہو، اگر الفاظ کا جامہ خوش رنگ نہیں یا پیرایہ بیان مرغوب نہیں تو تخیل کی فلک پیمائی بالکل بیکار ہے۔ متین اور سنجیدہ شعر سادہ زبان میں کہو۔ الفاظ پرست بن جاؤ۔ میں ایک پوری نظم کسی حسب منشا لفظ دستیاب نہ ہونے کے سبب دو دو سال روکے رکھتا ہوں''

سچ کہا ہے:

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شعر کہنا کام ہے آتش مرصع ساز کا

الغرض! تاجور لاہور کی ادبی و شعری محفلوں میں ایک مرکزی حیثیت رکھتے تھے۔ حفیظ جالندھری سے معرکہ آرائی تھی۔ اس لیے تاجوری اور حفیظ جالندھری کا قافلہ الگ الگ مشاعرے

بھی منعقد کرواتا تھا۔ تاجور کے چند خوبصورت اور عمدہ شعر دیکھئے:

تم نے لڑا لڑا کے نگاہیں چرائی آنکھ
ہم نے ملا ملا کے نظر دل ملا دیا
دن رات انکو یہ کھیل زیب دیتا ہے تاجور
مٹی پہ میرا نام لکھا لکھ کر مٹا دیا
الفت سے راز راز کی حد تک ہے سرفراز
جب داستان بزم بنی خوار ہوگئی
خود داری جنون نے نہ جانے دیا وہاں
کم بخت راہ دوست میں دیوار ہوگئی
اف وہ نظر کہ سب کے لیے دلنواز ہے
میری طرف اٹھی ہے تو تلوار ہوگئی

علامہ نیاز فتح پوری کا تاجور کی شاعری کے بارے میں تاثر یہ ہے کہ ''تاجور نجیب آبادی نے گو نظمیں بھی کہی ہیں۔ لیکن ان کا شمار غزل گو شعراء میں کیا جائے گا کیونکہ ان کا فطری ذوق جسے وہ پنجاب سے لے کر گئے ہیں، یہی تھا۔ افسوس ہے کہ یہ اپنے کلام کی شیرازہ بندی کی طرف سے بہت بے نیاز واقع ہوئے ہیں۔ ورنہ ان کا دیوان آج سے بہت پہلے شائع ہوگیا ہوتا۔ ان کے کلام کی خصوصیت الفاظ کا رکھ رکھاؤ اور خیال کی بلندی ہے۔ ادنیٰ جذبات یا نحیف خیالات سے ان کی غزلیں بالکل پاک ہیں۔'' تاجور کے شاگرد اور اردو کے اہم شاعر کرپال سنگھ بیدار نے تاجور کی شاعری کے متعلق بہت ہی عمدہ شعر کہا ہے:

اب محفل سخن میں کوئی سحر گر کہاں
شاعر تو سینکڑوں ہیں مگر تاجور کہاں

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ایسی شاعری کہاں ملے گی جس میں فنی، فکری پختگی، الفاظ کی حسن سلیقگی رکھ رکھاؤ ملے۔ تاجور صرف دین شاعری کے امام نہیں ہیں بلکہ انہوں نے اردو ادب میں اصلاحی کوششیں بھی کیں۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون ''اردو نظم ہندی بحروں میں'' (مطبوعہ ''ہمایوں'' ستمبر ۱۹۲۳ء) میں یہ لکھا کہ ہماری شاعری، ہندوستانی شاعری اس وقت ہوسکتی ہے کہ اس کی زبان ہندی آمیز ہو، وہ ہندی وزنوں میں ہو وہ ایسی ہو کہ اس میں ہر ہندوستانی اپنے جذبات آسانی سے موزوں کر سکے۔ جاہل سے جاہل اور گنوار سے گنوار، اگر وہ شاعرانہ طبیعت رکھتا ہے، اس

میں گنگنا سکے۔ میں ولی دکنی کی قائم کی ہوئی عمارت کو یکسر منہدم کرنا نہیں چاہتا۔ موجودہ اردو نظم مروجہ نظموں وزنوں میں ہو اور ضرور ہو لیکن ولی کی اس جدت پر اس قدر فریفتگی کو بھی میں اردو شاعری کے لیے مہلک تصور کرتا ہوں کہ ملکی حالات اور ملکی مصلحتوں سے بے نیازی برتی جاسکے۔ ولی نے تفنن طبع کے طور پر اردو کو ہندی وزنوں کے بجائے فارسی بحروں میں ڈھالا لیکن اس کے بعد اس کی عالمگیری پیروی نے سچ یہ ہے کہ اردو کو اپنے کروڑوں ہمدردوں سے محروم کر دیا۔'' ان کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی جذبات کا سیلاب دجلہ کے بجائے گنگا کے رخ بہنے لگے۔ جس طرح خدائے سخن میر اور ملک الشعراء نے ہندی نظموں میں ہندی وزنوں میں غزلیں کہی ہیں۔ اردو کے سربرآوردہ شعراء بھی کہیں اور فارسی وعربی اور ان کے طوق وزنجیر سے، اپنے زبان کی شاعری کو آزاد کرلیں۔

تاجور نے ''اردو شاعری'' اور ''بلینک ورس'' (مطبوعہ ہمایوں جنوری ۱۹۲۳ء) کے ذریعہ اردو میں نظم معریٰ کی تحریک چلائی جو کہ ان سے قبل مولانا عبدالحلیم شرر نے شروع کی تھی اور بقول خلیل الرحمٰن اعظمی نظم معریٰ کی تحریک کو اس زمانے کے بعض نوجوانوں نے لبیک کہا اور اسے اردو شاعری اور خود اپنے حق میں ایک نیک فال تصور کیا۔ مولانا تاجور نے نظم معریٰ کے بارے میں اپنی پالیسی کی وضاحت یوں کی ہے:

''میرے خیال میں بے قافیہ نظموں کو رائج کرنا اردو نظم کی گراں قدر اصلاح ہے میرا ارادہ ہے کہ انجمن ارباب علم پنجاب اور رسالہ ہمایوں کے ذریعہ اردو نظم میں بلینک ورس کو رواج دوں۔''

مذکورہ بالا مضمون کی بابت ڈاکٹر حنیف کیفی لکھتے ہیں کہ ''اس مضمون کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ عبدالحلیم شرر کے مقابلے میں تاجور نجیب آبادی کے مطالعے اور معلومات کا دائرہ زیادہ وسیع ہے۔ یہ فاضل دیوبند نہ صرف عربی، فارسی اور اردو زبان وادب پر گہری نظر رکھتا ہے بلکہ اس کی رسائی سنسکرت، ہندی اور انگریزی شاعری تک بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نظم معرا کی یہ تحریک تو وسیع تر علمی پس منظر کے ساتھ ظہور پذیر ہوئی اور اسے زیادہ پیمانے پر واضح تر مقاصد اور پختہ تو دلائل کے ساتھ پیش کیا گیا۔

تاجور نے مختلف ادبیات کے حوالے سے نظم معریٰ کی افادیت پر روشنی ڈالی اور واضح طور پر لکھا کہ قافیہ کی پابندی، اس پر الفاظ کی ہم قافیگی کی غیر محدود شرائط ان غیر ضروری پابندیوں نے نظم اردو کو پھولنے پھلنے نہیں دیا۔ انہوں نے اس پر افسوس کا اظہار کیا کہ ''تہی دست ہونے کے باوجود تعزیرات نظم، تعزیرات ہند سے زیادہ سخت گیر ہیں۔''

تخلیقی جمہوریت اور تاجور کا تصورِ ہندوستانیت

علامہ تاجور نجیب آبادی، اس زبان اردو کے ادیب وصحافی تھے جس کے بارے میں کرشن چندر کا خیال یہ ہے:

''اردو ادب شروع ہی سے ایک مشترکہ ہند آریائی تہذیب اور کلچر کا گہوارہ رہا ہے۔ اس کی ترویج واشاعت میں ہندوؤں اور مسلمانوں، سکھوں اور عیسائیوں نے مل جل کر حصہ لیا ہے۔ اردو ایک ہندوستان گیر زبان ہے۔ اس نے اپنے دائرہ اثر میں ہر مذہب وملت، ہر رنگ ونسل کے افراد کے محسوسات اور جذبات کو سمو کر انہیں ایسا ادبی رنگ وروپ عطا کیا ہے جس سے اس زبان کے ادب وشاعری پر باہمی میل جول، رواداری، اتحاد ومحبت، اخوت وقومی یک جہتی کے جذبوں کی گہری چھاپ پڑ چکی ہے۔ ان ہی عناصر کی موجودگی نے اردو زبان کے ادب کو ایک سیکولر مزاج عطا کیا ہے جو سارے ہندوستانی عوام کے جمہوری جذبے سے ہم آہنگ ہے۔''

(شاعر ممبئی قومی یک جہتی نمبر ۱۹۹۰ء ص ۱۵۷-۱۵۸)

اور حقیقی معنوں میں علامہ تاجور، اردو ادب کی سیکولر شخصیت ہیں جنہوں نے پوری زندگی ہندوؤں اور سکھوں میں اردو کو مقبول بنانے میں صرف کر دی۔ ان کا ذہن ودل ہندو مسلم امتیاز کی آلائشوں سے پاک تھا۔ اس کی اک وجہ یہ بھی تھی کہ منشی فاضل کا امتحان پاس کرنے کے بعد جس دیال سنگھ ہائی اسکول میں تاجور اورینٹل ٹیچر ہوئے تھے۔ اس کے ہیڈ ماسٹر رگھوناتھ سہائے انتہائی درجہ بلند اخلاق اور غیر متعصب انسان تھے۔ مولانا کو ان کی خوبیاں اس قدر اچھی لگیں کہ بقول عبدالمجید سالک ''رگھوناتھ سہائے جیسے ہندوؤں کے حسن سلوک ہی کا نتیجہ تھا کہ تاجور کے مخلصانہ روابط زندگی بھر ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ رہے۔ مسلمان اکابر میں سے صرف دو تین ہی سے مولانا کی رسم وراہ تھی۔'' (عبدالمجید سالک، یارانِ کہن ص ۲۲)

علامہ ہمیشہ غیر مسلموں کو آگے بڑھانے کے لیے کوشاں رہے۔ اس کی خاطر انہوں نے خود غزلیں لکھ کر دیں اور حوصلے بڑھاتے رہے۔ انہوں نے اچھے لکھنے والے بہت سے ادیب وشاعر پیدا کر دیئے جن کا تعلق غیر مسلم طبقے سے تھا۔ اس تعلق سے گوپال متل نے لکھا ہے کہ:

''غیر مسلم شاعروں کے خلاف امتیاز برتنا تو کجا، مولانا تو ہمیشہ اس کوشش میں رہتے تھے

کہ انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر سامنے لایا جائے۔ میرا خیال ہے کہ پنڈت ہری چند اختر کو چھوڑ کر ایک بھی اچھا لکھنے والا ہندو یا سکھ نہ تھا جس کا تعاون "شاہکار" کو حاصل نہ ہو اور پنڈت ہری چند اختر کے معاملے میں بھی جو چیز دیوار بن گئی تھی، وہ ان کا مذہب نہیں تھا بلکہ حفیظ جالندھری اور مولانا تاجور کی غیر مختتم جنگ تھی۔"

(گوپال متل، لاہور کا جوذکر کیا۔ دہلی، مکتبہ تحریک ۱۹۷۱ء ص ۴۰)

انہوں نے غیر مسلم شاعروں کی شعری تخلیقات، حوصلہ افزا ستائشی کلمات کے ساتھ شائع کیں۔ چنانچہ اپنے مقتدر ادبی مجلّہ "ادبی دنیا" میں کرپال سنگھ بیدار کی نظم "مہتاب" اس نوٹ کے ساتھ شائع کی:

"یہ ذہین و فطین، لائق و فائق سکھ نوجوان کئی سال سے مشق سخن کر رہا ہے مگر ضبط استقلال دیکھئے کہ اس نے اپنے کلام کی اشاعت اس وقت تک نہیں کی جب تک اسے اپنے کلام کی خامیاں دور ہونے کے متعلق یقین نہ ہوگیا۔ ملک کے مشہور اخبار نویس دینا ناتھ صاحب کی یہ رائے ہے کہ کرپال سنگھ بیدار مستقبل قریب میں قابل رشک مقام حاصل کرے گا اور بہت سے مشہور شعراء سے تو اب بھی سبقت لے گیا ہے۔"

(ماہنامہ ادبی دنیا لاہور، فروری ۱۹۳۱ء)

اسی طرح مولانا نے پنڈت میلا رام وفا کے بارے میں لکھا کہ:

"وفا صاحب کی بلند و پاکیزہ اردو نظمیں دیکھ کر اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اردو شاعری مسلمانوں کی کوئی میراث نہیں ہے۔ انکی سادہ مگر بلند قسم کی ادیبانہ نثر نگاری، انکا بے مثل ذوق تنقید، انکی جدت آمیز انشاء پردازی انہیں ملک کے ان چندور چند قابل قدر اہل قلم میں شمار کرتی ہے جن پر اہل ملک اور ملکی ادب کو فخر ہوسکتا ہے۔"

(ماہنامہ ادبی دنیا لاہور، اگست ۱۹۲۹ء)

واقعہ یہ ہے کہ مولانا ایک روشن خیال ادیب اور سورج دماغ شاعر تھے — انسانی وحدت و کلیت پر ان کا یقین کامل تھا۔ صوفیائے کرام کی طرح مذہبی بنیاد پر کسی قسم کی بھی منافرت کو ناروا سمجھتے تھے۔ بین مذاہب اتحاد و یک جہتی کے قائل ایک روشن ضمیر شخص تھے۔ مذہب کے میزان میں کسی فرد کی اچھائی یا برائی کو نہیں تولا۔ ان کے سامنے مذہب کا وسیع ترین تصور تھا جس میں رنگ و نسل کا کوئی امتیاز نہیں۔ وہ انسانی رشتوں ہی کو اہمیت دیتے تھے۔ ان کی نظر مجموعی انسانی صفات اور ان کی خوبیوں پر تھی۔ وہ تاریخ کی اس حقیقت سے واقف تھے کہ مذہب اور قومیت یہ دونوں چیزیں

بڑی جنگوں کی ذمہ دار رہی ہیں اور ان ہی دونوں اسباب کی وجہ سے بے گناہ انسانی جانوں کا اتلاف ماضی میں ہوتا رہا ہے اور حال بھی اسی سے پاک نہیں ہے اور مستقبل میں بھی ایسا ہی کچھ ہوگا۔ اس لیے انہوں نے اپنی انصاف پسندی کے تقاضے کے تحت اولین اہمیت انسانی رشتوں کو دی اور مشکوک ومجہول معتقدات پر اس عظیم انسانی رشتے کو قربان نہیں کیا — عدل وانصاف کا یہی معیار انہیں مذہبی شدت پسندی سے بے نیاز کرتا ہے اور ایک آزاد بلند خیال صحت مند فکر رکھنے والے انسان کی حیثیت سے معاشرے میں متعارف کراتا ہے۔

علامہ تاجور نے کھل کر ہندو مسلم امتیاز وتفریق کی مخالفت کی اور ایسی ذہنیتوں کی بیخ کنی کی جو تفرقات، تعصبات کو فروغ دینے کے لیے کوشاں تھیں۔ چنانچہ علامہ نیاز فتح پوری (م۱۹۶۶ء) نے جب یو پی کے ہندوستان اکادمی کے فیصلے کی مذمت کی کہ اس نے انگریزی کی ایک ایک کتاب کے اردو ترجمے کا کام منشی دیا نرائن نگم اور چودھری جگت موہن لال رواں کے سپرد کیا تھا۔ مولانا تاجور نے اس پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے علامہ نیاز فتح پوری کے خیال کی پرزور تردید کی۔ تاجور لکھتے ہیں:

''یو پی کی ہندوستانی اکیڈمی نے انگریزی کی کسی کتاب کے ترجمے کا نام منشی دیانرائن نگم ایڈیٹر ''زمانہ'' اور چودھری جگت موہن لال رواں ایم اے کے سپرد کیا ہے۔ معاصر نگار لکھنؤ اس انتخاب پر مطمئن نہیں۔ ہر شخص کو کسی خاص فرد کے متعلق رائے رکھنے کا حق حاصل ہے۔ لیکن ''نگار'' نے اس اختلاف کو اصولی رنگ میں پیش کرتے ہوئے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ 'ہندو انشاء پرداز صحیح اردو لکھنے پر قدرت نہیں رکھتے۔'' ہم اس خیال کی پرزور تردید کرتے ہیں نہ صرف تردید بلکہ صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ معاصر ''نگار'' کا یہ خیال حد درجہ غلط ہونے کے علاوہ شرانگیز بھی ہے۔ ربع صدی تک اردو کو اوڑھنا بچھونا بنائے رکھنے پر بھی اگر دیانرائن نگم کو اس لیے صحیح اردو لکھنی نہیں آتی کہ وہ ہندو ہیں تو پھر ہندو قوم کے ۲۲ کروڑ افراد کے حق میں اردو زبان کو ٹھونسنے کا تمہیں کیا حق ہے؟ نیاز صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس قسم کے اشتعال انگیز خیالات کا اظہار کر کے وہ اردو زبان اور مسلمانوں کی کوئی خدمت نہیں کر رہے ہیں۔ منشی دیانرائن نگم نے رسالہ ''زمانہ'' کے ذریعہ ملک میں اردو زبان کے بہت سے بلند رتبہ مصنف شاعر اور ادیب پیدا کر دیئے ہیں۔ اردو کے بے مثل اور بے حریف افسانہ نگار پریم چند کا گہوارۂ شہرت ''زمانہ'' ہی تھا — درگا سہائے سرور کی غیر فانی شاعری

''زمانہ'' ہی کے ذریعہ روشناس خلق ہوئی۔ جگت موہن لال رواں کی رباعیات اردو لٹریچر میں نئی چیز ہے۔ ان کا رنگ تغزل قابل صد تحسین ہے۔ اگر ہندوستانی اکیڈمی نے کوئی کتاب انہیں ترجمہ کرنے کے لیے دے دی ہے تو کوئی گناہ کبیرہ یا صغیرہ نہیں کیا۔ اردو کسی خاص قوم یا فرقے کی زبان نہیں، نہ دہلی لکھنؤ کے جغرافیہ میں نظر بند کی جاسکتی ہے۔ ہر شخص جو اس سے دلچسپی رکھتا ہے، ملک کے ہر حصے میں کوشش کرکے اس میں مہارت حاصل کرسکتا ہے۔ ہندو اخبارات، ہندو رسائل اور ہندو اہل قلم کے ذریعہ جو اردو ادب کی خدمت ہو رہی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اردو کے کفن بردوش حامی بھی اس کے لیے اتنے مفید نہ بن سکے۔ ہم حضرت نیاز سے التجا کرتے ہیں کہ وہ خدارا اردو زبان کے تذکرے میں ہندو مسلم سوال نہ اٹھائیں کہ اس سے اردو کے خلاف ضد آمیز جذبات پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔'' (ماہنامہ ادبی دنیا لاہور، فروری ۱۹۳۱ء)

مولانا کو اس بات پر یقین کامل تھا کہ قومی اتحاد کے لیے میڈیا بہت ہی موثر اور فعال کردار ادا کرسکتی ہے۔ اس لیے انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے ذرائع ابلاغ و ترسیل کے مثبت اور غیر جانبدارانہ کردار پر زور ڈالا۔ قومی مفادات کو نقصان پہنچانے والے اور سماج میں منفی رجحانات کو فروغ دینے والے اخبارات پر نکتہ چینی کرتے ہوئے لکھا:

''ہندوستان کے امن و امان، ہندوستان کی ترقی اور ہندوستان کی آزادی کے لیے ہندو مسلم اتحاد سے زیادہ ضروری چیز اور کوئی نہیں۔ اس ضروری امر پر ملک کے تمام رہنما، ہر طبقے کے اخبارات اور ہر فرقے کے اہل الرائے ایک زبان نظر آتے ہیں۔ سب یہ جانتے مانتے اور محسوس کرتے ہیں کہ ہندو مسلم، اتحاد کے بغیر ملک آزادی کی راہ پر نہ گامزن ہوسکتا ہے نہ کبھی ہوا ہے۔ مگر اس کے باوجود اس مقصد اہم کے حاصل کرنے کی صدق دلانہ اور صحیح کوشش بہت کم ہو رہی ہے۔ اور موجودہ حالات میں ہو بھی نہیں سکتی۔ کیونکہ اخبارات کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے دی گئی ہے۔ یہ اہمیت اس لیے ملک کے حق میں زیادہ ضرر رساں ثابت ہو رہی ہے کہ چند اخبارات سے قطع نظر عموماً کثرت ان اخبارات کی ہے جو سیاسی پارٹیوں کی بجائے کسی فرد واحد کی ملکیت میں ہیں اور وہ عموماً اپنے تجارتی اغراض پر ملک کے مفاد کو قربان کر دینے میں مطلق تامل نہیں کرتے۔ ملک کے مخلص رہنما بھی ان اخبارات پر نکتہ چینی کرتے ہوئے ڈرتے ہیں کیونکہ اخبارات کے ہاتھوں زندگی بھر کی ملکی و ملی خدمات بھی رسوائیوں کے

طوفان اٹھا کر ہٹا دی جاتی ہیں — جن لیڈروں نے آگے بڑھ کر اخبارات کی عوام کش پالیسی پر کبھی زبان طعن دراز کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی آواز معاندانہ ہاؤہو میں گم کر کے انہیں گوشہ گیری پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ ان نام نہاد اخبارات کی پالیسی عجیب متضاد واقع ہوئی ہے۔ اسے دیانت دارانہ صحافت کا نام تو کسی طرح نہیں دیا جاسکتا۔ پالیسی یہ ہے کہ جس گناہ کے ارتکاب پر دوسرے مذہب کے کسی آدمی کو ہدف ملامت بنایا جاتا ہے، بعینہ اسی غلطی پر اپنے ہم مذہب کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ لیجئے کہ ہر فرقے کے اخبارات، اپنی قوم کے غنڈوں کی عیب پوشی بلکہ عیب ستائی پر ایک زبان ہو جاتے ہیں اور اس غلط حمایت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فساد انگیز اور بے کیرکٹر لوگ بڑھ کر ''مولانا'' اور ''شریمان'' کے خطابوں کی بارش میں لیڈری سنبھال لیتے ہیں اور پھر اس لیڈری کا انجام عرب شاعر کی زبان میں یہی ہوتا ہے:

ولو کان الغراب ولیل قوم

سیھدیھم طریق الھالکین

(کوا کسی قوم کا رہنما بن جائے تو اسے جلد ہلاکت کے راستے پر ڈال دیتا ہے)

— (شاہ کار لاہور، ایڈیٹر تاجور نجیب آبادی، اپریل ۱۹۳۵ء)

اور یہ حقیقت ہے کہ فرقہ وارانہ تعصبات فسطائیت کو بڑھاوا دینے اور نفرتوں کی خلیج وسیع کرنے میں اخبارات کا زبردست حصہ رہا ہے۔ زرد صحافت نے قومی مفادات کو جو نقصانات پہنچائے ہیں، اس سے لوگ اچھی طرح واقف ہیں۔ مفاد پرست اور خود غرض سیاست دانوں نے اس صورت دل سے خوب فائدہ اٹھایا۔

اور یہ بھی ایک سچ ہے کہ ہمارے معاشرے میں صرف ان لیڈروں کو شہرت ملی اور قوم نے انہیں اپنا رہنما تسلیم کیا جو جذباتیت سے مغلوب، سیاسی بصیرت وتعقل اور دور اندیشی سے بے نیاز ہو کر تقریروں کا جوہر دکھاتے رہے۔ اس طرح جذباتی انداز فکر کی ایک مہلک روایت قائم ہو گئی جس کی وجہ سے پوری قوم آتش نمرود میں بے خطر کود پڑی اور جس کا خمیازہ آج تک بھگت رہی ہے۔

مولانا تاجور پر قومی اتحاد، یک جہتی کا اس قدر اثر ہے کہ اردو شعر و ادب میں بھی ''ہندوستانیت'' پر زور ڈالتے تھے اور ادب کے حوالے سے وہ عبداللہ اور رام چندر کے امتیازات مٹانے کے خواہش مند تھے۔ ان کی تمنا تھی کہ اردو لغات سے فرقہ وارانہ اصطلاحیں ختم کر دی جائیں

اور ایک ایسے سماج کی تشکیل کی جائے جس میں سب ہندوستانی ہوں اور مذہب کو ایک ذاتی فعل کی حیثیت حاصل ہو۔ دراصل یہ تصور اور خیال ان کے گہرے اور وسیع ماحولیاتی مشاہدے کا نتیجہ ہے۔ بند کمرے میں ہوتے تو ان کے خیالات بھی گھٹن زدہ اور جذباتیت سے معمور ہوتے لیکن انہوں نے کھلی آنکھ سے دنیا دیکھی تھی اور احوال کا مشاہدہ کیا تھا۔ اس لیے ان کے تصورات و افکار میں بھی آزادی اور کھلے پن کا احساس ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''اردو شاعری نے تقلیدی نشو ونما کے سبب فارسی شاعری کی بے ضرورت پابندیوں اور بے محل فنی قیود سے اپنا بال بال گرفتار کر رکھا ہے۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ اس کی موجودہ صنفی حیثیت کو دیکھتے ہوئے اسے بمشکل ہندوستانی شاعری کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اس کے اوزان و بحور بدیشی، اس کے خیالات و تلمیحات بدیسی۔ اس کے لیلیٰ مجنوں اور فرہاد شیریں بدیشی۔ اس کے بلبل و بہار بدیشی، اس کی ساخت اور اس کا سراپا بدیشی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری میونسپلٹی کے حدود سے باہر نہیں نکل سکی ہے۔ حالانکہ ملکی شاعری، ملک کے دیہاتوں، بادیہ نشینوں اور شہری زندگی سے بے خبر لوگوں میں پیدا ہوتی ہے۔ انہیں میں فروغ پاتی ہے۔ وہی اس کے پیکر میں فطرت کی روح پھونکتے ہیں۔ دیہات اور صحراؤں کی آزاد ہوا، اسے راس آتی ہے۔ میونسپل ایریا میں گھس کر اپنے بے داغ سادہ اور فطری لباس اتار کر صنعتی رنگینیوں میں ڈوب گئی۔ بخلاف اردو شاعری کے کہ یہ تمدن اور تہذیب کے گہواروں میں کروٹیں بدلنے کی عادی ہوگئی ہے۔ اسے شہر سے نکالنا مچھلی کو پانی سے باہر کر دینے کے برابر زندگی سوز ہے۔ یہیں سے یہ فیصلہ کرنا آسان ہوجاتا ہے کہ اردو شاعری، غیر ہندوستانی زندگی بسر کر رہی ہے۔ اسے بھی بنانے کے لیے ہمیں اصولی تبدیلیاں کرنی پڑیں گی۔ اس کے لیلیٰ مجنوں کی جگہ ہیر رانجھے کو ملنی چاہیے۔ اس کے رستم وسہراب کو بھیم وارجن کے لیے جگہ خالی کرنی ہوگی۔ اس کی بہار کو برسات سے۔ اس کے بلبل کو کوئل سے۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ اب تک جو شاعری ہوچکی ہے وہ دریا برد کر دینے کے لائق ہے قطعاً نہیں کیونکہ باوجود اس فطری زندگی کے اردو شاعری میں زندگی کے لیے بہت سی عبرتیں، رفعتیں اور رہ نمائیاں پنہاں ہیں۔ غالب، حالی، اکبر، اقبال اور دوسرے بلند رتبہ اردو شعراء کے ساحرانہ کارناموں کو ہم کیونکر فراموش کر سکتے ہیں۔ ہم جو پروگرام پیش کر رہے ہیں، اس کا مقصد یہ ہے کہ اردو شاعری کو ایسے ہندوستانی قالب میں ڈھالا

جائے کہ اس کے چہرے سے ہندوستانیت ٹپکے۔ ہندوستانی خیالات کی یہ آئینہ داری کرے اور ہندوستان بہ حیثیت مجموعی اسے اپنا سمجھنے لگے— نہیں اس خوش قسمت ہندوستان کو ہر وقت نگاہ یقین کے ساتھ رکھنا چاہیے— جب عبداللہ اور رام چندر کے امتیازات مٹ جائیں گے، جب ہندو مسلم مفاد کی خونریز فرقہ وارانہ اصطلاحیں لغات سے چھیل کر مٹا دی جائیں گی اور جب ہندوستان میں صرف ہندوستانی پیدا ہوا کریں گے۔ جب مذہب کو اجتماعی حیثیت کے بجائے ذاتی عقیدے کی صورت اختیار کرنی پڑے گی۔ اس وقت وہی زبان، وہی شاعری، وہی لٹریچر ہندوستانی لٹریچر کی حیثیت میں ہندوستان گیر مقام حاصل کر سکے گا جس میں ہندوستانی قوم کے ملکی خط و خال سب سے زیادہ روشن نظر آئیں گے۔" (ماہنامہ ادبی دنیا لاہور، فروری مارچ ۱۹۳۲ء)

مولانا تاجور کی بہت سی باتوں سے اختلاف کے باوجود اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ امیر خسرو کی طرح ہندوستان سے محبت و شیفتگی کے جذبات ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ انھوں نے سنسکرت اور ہندی شاعری سے استفادے اور گنگا جمنی روایت پر توجہ دی کیونکہ وہ اس ادبی روایت کے امین تھے جس میں عادل شاہ، قلی قطب شاہ، نظیر اکبرآبادی، آتش جیسے انسان پرستوں، اور ہندو مسلم اتحاد کے علمبرداروں کے نام آتے ہیں۔ جس زبان و ادب میں کعبہ سے زیادہ حیثیت ایک انسان کے دل کی ہے اور جس میں خدا کو کعبہ میں ڈھونڈنے کے بجائے دل میں ڈھونڈنے کا رواج ہے جہاں اسلام کی رونق کے لیے کفر کو ضروری سمجھا جاتا ہے اور جس زبان میں رواداری محبت، یگانگت کے جذبات کے مظہر یہ اشعار ہیں:

اے شیخ دگبر سبحہ و زنار چھوڑیئے
پر دل کسی بشر کا نہ زنہار توڑیئے
بت خانہ کھود ڈالیے مسجد کو ڈھایئے
دل کو نہ توڑیئے یہ خدا کا مقام ہے
کون چھینے بت کو، توڑے برہمن کے دل کو کون
اینٹ کی خاطر کوئی کافر ہی مسجد ڈھائے گا

علامہ تاجور کا نام اس ادبی، جمہوری، بشری روایت کے تسلسل کو برقرار رکھنے والوں میں آتا ہے جو قومی اتحاد کی خاطر بزرگوں کی ڈانٹ سہتے رہے۔ مگر اپنے اصول و نظریہ کی قربانی نہیں دی۔

✪✪✪

ناطق گلاؤٹھی—لفظوں کا رمز شناس

دنیا میں مختلف طبیعتوں اور متضاد ذہنوں کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ ہر شخص اپنی ذہنی مناسبت کے اعتبار سے اپنے لیے کوئی راہ منتخب کرتا ہے۔ کوئی سیاست کے کوچے میں داخل ہوتا ہے تو کوئی علوم وفنون کے بحرِ ذخار میں غوطہ زن ہوتا ہے۔ کوئی ادب کے دشت کی سیاحی کرتا ہے تو کوئی فقہی و تفسیری موشگافیوں میں کھوسا جاتا ہے اور کچھ ایسے بھی نابغۂ روزگار اور عباقرہ ہوتے ہیں جن پر قادر مطلق ہر فن، ہر ہنر کے دروازے کھول دیتا ہے کہ اس کی ذات سے یہ بعید نہیں۔

لیس علی اللہ بمستنکر
ان یجمع العالم فی واحد

دیوبند کے فیض یافتہ بھی ایسے ہیں جنہوں نے اپنے لیے الگ الگ راہیں چنیں، کوئی مفسر ہوا، کوئی فقیہ، کسی نے منطق میں شہرت حاصل کی تو کوئی تصوف کا امام بنا۔ مولانا ابوالحسن ناطق گلاؤٹھی نے ادب کا میدان پکڑا کہ یہ خاصا وسیع تھا۔ اسی سے ان کی زندگی کو رنگ و روغن ملتا تھا۔ یہی وہ راہ تھی جو ذہن سے میل کھاتی تھی۔ پھر تو ناطق گلاؤٹھی ادب کی راہوں میں ایسے گم ہوئے کہ باہر نکلنا دشوار ہوا اور یہ دشواری یوں بھی بڑھی کہ حضرت داغ دہلوی نے بیچ راستے میں پکڑ لیا، اب دامن چھڑا کر جائیں تو کہاں جائیں۔ اس کوچۂ قاتل کے سوا سب راستے بند تھے، سو وہ ادب میں بھی انگوٹھی کے نگینے کی طرح جڑ گئے۔ شاعری کی معشوقاؤں سے دامن بچا کر جاتے بھی تو کہاں۔ گو لطف کچھ دامن بچا کر گزر جانے میں تھا مگر ہائے نصیب شاعری کی دیوی کی ناز برداری کرنی پڑی۔ ''ربات الشعر'' کی طلسمی قوتوں سے بچنا محال تھا۔ معشوقاؤں نے گریبان کچھ اس طرح سے چاک کیا کہ یہ چاک دامانی بھی انہیں اچھی لگنے لگی:

اے رفوگر ڈالتا ہے کیوں پھٹے میں پاؤں تو
رہنے دے اچھی ہے میری چاک دامانی مجھے

غم جاناں سے چھوٹے تو غم روزگار نے آگھیرا اور پھر آشوب دہر نے زندگی کا نقشہ ہی بدل

ڈالا، زندگی خواب پریشاں بن گئی اور پہلی جیسی بات نہ رہی:

ہر خوشی ہم سے گریزاں کبھی ایسی تو نہ تھی
سرخوشی، خواب پریشاں کبھی ایسی تو نہ تھی

شاعری شروع کی تو تلمذ کا دشوار مسئلہ سامنے آیا، پہلے محمد مرتضٰی بیان یزدانی میرٹھی سے یہ رشتہ جوڑا جو بقول لالہ سری رام ''جملہ اصناف پر قادر تھے۔ ایک عجیب کمال ان کے ہمہ گیر طبیعت میں یہ تھا کہ جس رنگ میں چاہتے، فکر سخن کرتے اور پھر یہ نہیں کہ قافیہ پیائی ہو بلکہ فی الحقیقت اس رنگ میں اپنے زور طبیعت سے وہ اختراعیں کرتے کہ سننے والے حیران رہ جاتے تھے۔'' (خمخانۂ جاوید)

ان کے بعد حضرت جلال لکھنوی سے مشورۂ سخن کے آرزومند ہوئے مگر جلال کی شان جلالی، انانیت اور ہم عصر سخنوروں کی تحقیر، سدراہ بن گئی جس کی داستان ناطق نے یوں لکھی ہے: ''حضرت جلال لکھنوی سے میں ایک ہی مرتبہ ملا۔ دوران گفتگو میں معلوم ہوا کہ یہ بزرگ کسی کو کچھ نہیں سمجھتے۔ انہوں نے امیر مینائی کو ایک دیہاتی اور غیر شاعر کہا اور داغ کے متعلق فرمایا کہ وہ اہل علم نہیں، اس لیے ان کے سرمایہ سخن میں صرف ''گلزار داغ'' معتبر ہوسکتا ہے کہ اس پر استاد ذوق کی اصلاح ہے، وہ اسی ملاقات میں میرے اس شعر پر بھی اعتراض کر بیٹھے۔

ساغر پہ فاتحہ ہو، دل تشنہ کام کی
ساقی مصلیوں کو پلا میرے نام کی

فرمایا کہ لفظ ''فاتحہ'' مذکر ہے۔ جب میں نے جواب دیا کہ دہلی کے استعمال میں مونث ہے۔ اس میں تائے تانیث جو حالت وقفی میں ''ہ'' ہوجاتی ہے موجود ہے تو اہل دہلی، حق پر ہیں۔ اس پر جلال صاحب چڑ سے گئے اور تلخ کلامی تک نوبت آپہنچی۔''

مولانا عبدالرحمٰن راسخ دہلوی سے بھی رشتۂ تلمذ استوار کرنے کا خیال آیا مگر ان کے غیر محتاط رویے نے ارادے سے باز رکھا۔ بالآخر حضرت داغ دہلوی (۱۸۳۱-۱۹۰۵) کے کلام بلاغت نظام نے دامن دل کو کچھ یوں کھینچا کہ انہی کے ادبی آستانے پر جبین نیاز خم کردی، خود ناطق کی زبان میں:

> ''مجھے خیال ہوا کہ داغ دہلوی کے کلام کو دیکھوں کہ میں دہلی کے نواح کا باشندہ تھا اور ان کی ذات دہلی اور اہل دہلی کے لیے مایہ ناز تھی۔ ان کے دو دیوان ''گلزار داغ'' اور ''آفتاب داغ'' میں نے لے لیے جن میں بلحاظ صفائی زبان وسلاست بیان مجھے آفتاب زیادہ پسند آیا۔ میں نے اسے بہت پڑھا اور اتنا پڑھا کہ اس وقت یہ پورا دیوان مجھے حفظ ہوگیا تھا۔ اسی نے میری شاعری پر اثر کیا اور یہی میرے طرز بیان پر بلا ارادہ چھا گیا۔ ''آفتاب'' کی زبان میں میرا روزمرہ تھا۔ میرے گھر کا روزمرہ تھا

اور میرے قصبے کا روز مرہ تھا۔ اس لیے میں نے اپنے گھر کی زبان، بیان اور محاورات پر اپنی شاعری کو قائم کیا۔"

چنانچہ ۱۹۰۴ء میں خط و کتابت کے ذریعے حضرت داغ کے شاگرد بن گئے اور انہی کے رنگ میں شعر کہتے رہے۔ یہ اور بات ہے کہ طبع آزمائی کے لیے غالب، مومن اور میر تقی میر کے اسلوب و انداز بیان میں بھی کچھ غزلیں کہیں:

مومن پہ بھی ایمان ہے غالب پہ بھی ناطق
ہم ذوق کے انداز میں رہتے ہیں مگن اور

ناطق نے بہت اچھی شاعری کی اور اتنے عمدہ اور اچھے شعر کہے کہ فصیح الملک مرزا محمد خاں داغ دہلوی نے یہ سند عطا کی۔

مولوی صاحب! آپ کی غزل درست کر کے واپس کی جاتی ہے، جس شعر پر چار صاد کیئے ہیں، یہ مجھے پسند آیا اور یاد بھی ہوگیا، وہ یہ ہے:

بگڑ جانے میں بن آتی ہے شوق دید کیا کیا
دیا کرتے ہیں جب وہ گالیاں ہم منہ کو تکتے ہیں

یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ آپ ہر شعر میں کسی محاورے کا استعمال کرتے ہیں اور بیشتر کامیابی کے ساتھ مگر اس کا لحاظ رکھئے کہ شعر کے لیے محاورہ آجائے۔ محاورے کے لیے شعر میں سقم نہ آنے پائے اور یہ بھی خیال رہے کہ اس میں تصرف جائز نہیں۔ اگر آسانی کے ساتھ محاورہ بجنسہ بحر میں آجائے تو نظم کر دیجئے ورنہ نہیں اور اس کے لیے حضرت استاد مرحوم کے کلام پر غور کیجیے کہ انہوں نے کس بے ساختگی سے محاورات کو باندھا ہے۔ لفظ جو بن کے متعلق میں پھر یہی کہتا ہوں کہ اس کا استعمال بہ معنی پستان اہل لکھنؤ کا اختراع ہے۔ دہلی والے اسے اس معنی میں نہیں بولتے۔ آپ نے جو مولانا راسخ کا شعر پیش کر دیا ہے، اسے میں تسلیم نہیں کرتا۔ خدا جانے وہ کس دھن میں ایسا لکھ گئے۔ مولوی صاحب آپ کے دوست ہیں، انہیں سے پوچھئے کہ آپ نے دہلی میں اس لفظ کا استعمال کہاں سنا ہے۔ آخر آپ خود بھی نواح دہلی کے باشندے ہیں اور میرے نزدیک بڑی حد تک آپ کے قصبات کی زبان مستند ہے۔ غور کیجیے کہ کیا وہاں کے شرفا، یا عوام میں اس لفظ کا یوں استعمال ہے۔ دہلی کے استعمال کا بھی یہ لفظ ضرور ہے مگر اس طرح:

عجب جو بن برستا ہے کسی سے جب وہ لڑتے ہیں
ادائیں بھی بلائیں لیتی ہیں جس دم بگڑتے ہیں

بہرحال یہ اچھی بات ہے کہ آپ نے محض میرے لکھ دینے پر اکتفا نہ کر کے تحقیق کی طرف قدم بڑھایا، یہ وہ جرأت ہے جو ہر نو مشق کو نہیں ہوتی۔ مشق سخن کو بڑھایئے، مجھے امید ہے کہ آپ اس فن میں کامیاب ہوں گے۔'' (زبان داغ)

ناطق کے نام ۴ جولائی ۱۹۰۴ء کو لکھا گیا یہ خط ان کے روشن مستقبل کی پیشین گوئی بھی تھا اور ان کی شاعری کا اعتراف بھی۔ یہ صرف ایک خط نہیں بلکہ داغ کے ممتاز شاگرد احسن مارہروی (۱۸۷۶-۱۹۴۰ء) کے بقول یہ لاکھوں کے برابر ہے۔ داغ کی پیشین گوئی صحیح ہوئی اور شاعری کی دنیا میں وہ بلندیوں تک پہنچے۔ خاصان ادب نے ان کی شاعری کو سراہا مگر زمانے کی ناقدری کے شکار رہے۔ اردو کے ممتاز ادیب و نقاد ظ۔ انصاری مرحوم نے ''اساتذہ دہلی کی ہمسری کرنے والے اس قابل قدر شاعر'' کے دیوان پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کی شاعرانہ عظمت کا یوں اعتراف کیا ہے:

''ان کے کلام سے، جسے اونچا اڑنے کا دعویٰ بھی نہیں، جہاں خالص زبان کی شاعری کے جواہر پارے چننے کو جی چاہتا ہے، وہیں ذاتی زندگی کی بعض جذباتی نزاکتوں کی طرف بھی دھیان چلا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ ناطق کے کلام میں بت، برہمن، صنم، اور اس کے متعلقات اتنے پہلو بدل بدل کر آتے ہیں اور اس احتیاط کے ساتھ آتے ہیں کہ عجب نہیں جو دل کسی ''صنم'' سے اٹکا ہوا اور اسی نے انہیں شعری اور جذباتی صداقت کا پاٹھ کرایا ہو، اس معاملے میں وہ وفا پرست نکلے۔ ناطق جیسے شاعر زبان کے مرکز میں ہوں یا اس سے دور، کم نام ہوں یا گمنام، وہ ضائع نہیں ہوا کرتے اور نہیں تو لفظ کو برتنے کی تمیز سکھا جاتے ہیں، یہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ (کتاب شناسی، بمبئی، ۱۹۸۱ء، ص: ۳۷۸)

مقتدر رسائل میں ناطق کا کلام چھپتا بھی رہا اور مشاعروں میں بھی ان کی شرکت ہوتی رہی مگر یہ مشاعرے ان کے بلند ذوق اور اعلیٰ معیار پر پورے نہ اترتے تھے، مشاعروں کی ناخوشگوار صورت حال کی شکوہ سنجی، مولوی عبدالباری آسی مرحوم کے نام لکھے گئے خط میں انہوں نے یوں کی ہے:

''— خدا جانتا ہے کہ نہ مجھے نام و نمود کی تمنا ہے اور نہ مشاعروں میں شریک ہونے کا شوق اور شوق ہوتا بھی تو ایسی حالت میں کیا شرکت گوارا کرتا جب کہ تک بندی کی داد ملتی ہے اور غلط شعر پسند کیے جاتے ہیں۔ میں نے بھی غزل پڑھی لیکن، اطہر، یگانہ، عطا بدایونی، بزم اکبر آبادی اور چند دہلی والوں کے علاوہ کسی نے داد نہ دی۔ لکھنؤ کے شعراء تو اس وقت خصوصاً خوش گپی میں مشغول تھے جس سے مجھے معلوم ہوا کہ سراج اور تقدیر میں کس قدر شکر گزاری کا مادہ تھا۔ آپ کے شاگرد وصل بلا فصل تو قابل ذکر

ہیں نہیں مگر مجھے ان باتوں کی کوئی پرواہ نہیں کہ میں تو مشاعرے کے لیے گیا بھی نہیں تھا اور زمین ایسی تھی کہ ہندوستان کا شاعر اعظم بھی تقطیع سے پھسل پڑا۔ فانی بدایونی کوئی کام کا شعر نہ نکال سکے اور یگانہ صرف دو شعر پڑھ کر معہ باقیات صالحات کے معافی مانگ کر منبر سے اتر آئے۔ باقی رہے جگر و جوش سو انہوں نے طرح میں راہ نہ پائی اور بے طرح سنائی، ساغر کس گنتی میں ہیں یہ بے چارہ بھی منبر پر آیا اور بے طرح گا گیا۔'' (نقوش لاہور، مکاتیب نمبر جلد دوم)

ناطق گلاوٹھی کا تعلق ممتاز خانوادہ سے تھا۔ ان کے جد اعلیٰ مولانا سید منہاج الدین، احمد شاہ ابدالی کی فوج کے ساتھ بھارت میں آکر مقیم ہوگئے تھے۔ ان کے جد امجد سید غلام غوث وکالت کرتے تھے۔ اس لیے ایک مدت تک میرٹھ میں اقامت پذیر رہے پھر گلاوٹھی میں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ ان کے والد ماجد سید ظہور الدین کامٹی میں تجارت کرتے تھے۔ وہیں ۱۱ر نومبر ۱۸۸۶ء میں ناطق پیدا ہوئے۔ ابوالحسن ناطق نے مبادیات کی تعلیم گھر پہ حاصل کی۔ اس کے بعد ۱۸۹۴ء میں گلاوٹھی کے مدرسہ منبع العلوم میں کچھ دنوں تعلیم حاصل کرنے کے بعد از ہر ہند دارالعلوم دیو بند تشریف لے گئے اور یہاں پر ممتاز اساتذہ علوم و فنون، صنادید فقہ و حدیث، اسیر مالٹا شیخ الہند مولانا محمود الحسن (۱۲۶۸-۱۳۳۹ھ) مولانا عبداللہ انبیٹھوی (۱۳۴۴ھ) خلیل احمد سہارنپوری (۱۲۶۹-۱۳۴۶ھ) احمد حسن مراد آبادی (۱۳۳۰ھ) ماجد علی جونپوری کے سامنے زانوئے علم و ادب تہہ کیا۔ دوران طالب علمی میں تصوف سے گہرا لگاؤ پیدا ہوگیا تھا۔ اس لیے حضرت قطب الارشاد مولانا رشید احمد گنگوہی (۱۲۲۸-۱۹۰۵ء) کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوگئے۔ دوسری طرف سیاست سے بھی دلچسپی پیدا ہوئی کیونکہ ناطق کا خاندان بھی سیاسی معاملات میں گہری دلچسپی لیتا تھا۔ ان کے عم محترم سید عنایت اللہ ۱۸۵۷ء کی تحریک میں حصہ لینے کے جرم میں برطانوی ظلم و تشدد کا شکار ہوئے۔ انگریزوں نے انہیں سولی پر لٹکا دیا۔ ناطق بھی اس وقت کی سیاسی سرگرمیوں میں دلچسپی لیتے رہے۔ کانگریس اور تحریک خلافت میں آگے آگے رہے۔ پھر سیاست میں عملی طور پر آگئے تھے۔ اس لیے ناگپور میونسپل کمیٹی کے ۱۹۲۱ء سے ۱۶۵۰ء تک ممبر رہے۔ ۱۹۲۶ء میں مرکزی اسمبلی کے لیے بھی منتخب ہوئے تھے۔ بہت دن تک شعر و ادب کی خدمت کرتے رہے مگر ۲۶ رمئی ۶۹ء کی رات میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔ میونسپل کارپوریشن نے یادگار کے طور پر ''مولانا ناطق روڈ'' اور ''مولانا ناطق چوک'' تعمیر کرائے۔

ناطق طالب علمی ہی کے زمانے سے شعر و ادب سے دلچسپی اور شغف رکھتے تھے۔ ان کی ابتدائی نظموں کا مجموعہ ''نطق ناطق'' کے نام سے شمس المطابع میرٹھ سے ۱۹۱۳ء میں چھپا اور ایک طویل مکتوب

پر مشتمل کتابچہ "کلیل میں غلیل" ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا۔ جو مولانا الطاف حسین حالی (۱۸۳۷ء-۱۹۱۴ء) کے درج ذیل شعر کے مفہوم اور اس کی تشریح سے متعلق ہے:

حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں
بس اتباع مصحفی و میر کر چکے

ادبی نوعیت کے مضامین اور مکاتیب پر مشتمل "سبع سیارہ" نامی کتاب فیض عام پریس لکھنؤ سے ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی جو بہت ہی مقبول اور مشہور ہے۔ ممتاز ادیب اور سخت گیر ناقد ڈاکٹر عندلیب شادانی (جنہوں نے حسرت، فانی، اصغر اور جگر کی شاعری کا مذاق اڑایا ہے) نے اس کتاب کو مولانا کے تبحر علمی کا آئینہ دار قرار دیا ہے:

"مولانا نے اس میں بہت سے لطیف نکتے نہایت حسن و خوبی کے ساتھ بیان فرمائے ہیں، کلام پر جو تبصرہ فرمایا ہے، وہ لائق تحسین فکر انگیز اور ادب آموز ہے۔ انتقاد نہایت صحیح اور نقاد کے تبحر علمی کا آئینہ دار ہے۔"

اس کے علاوہ دیوان غالب کی شرح جو سابقہ شروحات سے مختلف انداز میں لکھی گئی تھی۔ "کنز المطالب" کے نام سے ۴۲ برس کے بعد مکتبہ دین و ادب لکھنؤ سے ۱۹۶۸ء میں شائع ہوئی۔ مولانا کا شعری مجموعہ شاگرد رشید عبدالحلیم صاحب نے اکتوبر ۱۹۷۲ء میں شائع کیا ہے جو ۲۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

ناطق نے بہت اچھی شاعری کی۔ بنیادی طور پر کلاسیکی شعری روایت کے دلدادہ تھے۔ انہوں نے مختلف شعری اسالیب سے استفادہ کے باوجود امتیازی تشخص کو برقرار رکھا۔ عروض سے مکمل آگہی کی وجہ سے شاعری کے اسرار و رموز اور محاسن اور معائب پر گہری دست رس رکھتے تھے۔ ذوق، شاہ نصیر، مومن و غالب اور میر اور بہادر شاہ ظفر کے رنگ میں شعر کہتے رہے اور عمر بھر ان کے عاشق اور شیدائی رہے۔ ناطق کی شاعری میں خاص طور پر مجھے جو چیز نظر آتی ہے، وہ غالب کا سا انداز بیان ہے۔ ان کے بہت سے اشعار ان کی زمین میں ہیں اور فکر و خیال بھی ملتے جلتے ہیں۔ اس لیے ناطق کے یہاں غالب کا ذکر بار بار ملتا ہے:

شاعری جس کی ہو انداز سخن میں ناطق
دوسرا کون ہے غالب کے سوا میرے بعد

مومن پہ بھی ایمان ہے غالب پہ بھی ناطق
ہم ذوق کے انداز میں رہتے ہیں مگن اور

اس کے علاوہ بھی مختلف اساتذہ سخن کے اسالیب و اظہارات سے استفادہ کیا ہے جس کے واضح اشارے ان کے شعروں میں ملتے ہیں:

تمہارا نام آنے تک رہے دھوکے میں اے ناطق
ہم ان شعروں کو سمجھے کلیات میر کے ٹکڑے

مگر غالب سے فنی اور فکری استفادے کی جھلک مجھے ان کی پوری شاعری میں نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غالب کی تفہیم میں انہوں نے اپنی عمر کا ایک حصہ گزارا ہے اور اس کی شرح بھی لکھی ہے۔ اور پھر ان کے تلامذہ نے ان سے اصرار کیا کہ اساتذہ کے رنگ میں شعر کہیں تو انہوں نے ایسے شعر کہے کہ ایک دیوان مرتب ہوگیا۔

اس کا اعتراف حضرت آسی نے اپنے ایک مضمون مشمولہ رسالہ سخن ۱۹۳۴ء میں کیا ہے۔ ان کی شاعری میں ان کی زندگی اور شخصیت کے مختلف رنگ و روپ نظر آتے ہیں۔ ان کے جذبات اور محسوسات ان کی غزلوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ سادہ اور پرکار زبان میں باتیں کہنے کا ہنر انہیں خوب آتا ہے۔

تنہائی، اداسی، بے چینی اور خود شکستگی کا کرب شاعروں کا مقدر ہے۔ ایسے حالات میں شاعر خود کو بھلا دیتا ہے۔ پھر یاد نہیں رہتا کہ اس کا وجود ہے یا نہیں اور پھر جب کبھی خیال آجاتا ہے تو اپنی گم شدہ شخصیت کی تلاش میں نکل جاتا ہے۔ اس احساس کی عکاسی اس شعر میں دیکھئے:

نظر آتا نہیں اب وہ بھی اف رے تنہائی
آئینہ میں پہلے اک آدمی تھا میری صورت کا

زمانے کے پریشان کن حالات شاعر کو اس قدر مجبور کر دیتے ہیں کہ اپنی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی۔ زندگی ایک خواب پریشان بن جاتی ہے اور خوشیاں محرومیوں میں بدل جاتی ہیں۔ ایسے میں شاعر صرف افسوس کر سکتا ہے:

ہر خوشی، ہم سے گریزاں، کبھی ایسی تو نہ تھی
سر خوشی، خواب پریشاں کبھی ایسی تو نہ تھی

مگر شاعر ہے کہ مشقتیں برداشت کئے جاتا ہے۔ زندگی کی دھوپ میں تپ کر اس کی شخصیت اور نکھر جاتی ہے۔ رنج کا خوگر ہونے کی وجہ سے اب یہ مشکلات بھی آسان ہوتی نظر آتی ہیں، اس کے لیے شاعر گویا ہوتا ہے:

مشکلوں نے ہمیں اتنا تو سکھا رکھا ہے
ہم سکھا دیتے ہیں مشکل کو بھی آسان ہونا

شاعر کے پاس دل گداختہ بھی ہوتا ہے جس میں غم دوراں کے ساتھ ساتھ غم جاناں بھی لاحق ہو جاتا ہے۔اس لیے وہ دوہری مشکل میں ہوتا ہے۔غم سے چور، رنجور ومجبور انسان کی زندگی میں لطف و مسرت کہاں، اس کی زندگی تو عذاب کی مانند ہوتی ہے۔ رسوائیاں، ذلتیں، طعنے اور دشنام طرازیاں ہی ان کی زندگی کا نصیب اور مقدر ہوتی ہیں۔ اس پر مستزاد معشوق کی بیوفائی، غرور و ناز کا شکار ہوتی ہے تو اس کے بجھے ہوئے دل سے ایک دھواں سا اٹھتا ہے اور زبان پر یہ شکایت ہوتی ہے:

نہیں معلوم، تری رنجش بیجا کا علاج
کیا بتاؤں کہ مرے دکھ کی دوا کون سی ہے
تم ہو مختار، تمہارے لیے بیجا ہے کیا
میں ہوں مجبور، مری بات بجا کون سی ہے

شاعر کو بے وطنی، بے گھری، یا گھر کی ویرانی اور وحشت کا خیال بار بار آتا ہے اور خوف و اداسی میں اضافہ کر جاتا ہے:

کئی جنگل ہیں دیوانے کے گھر میں
ضرورت کیا ہے دیوانہ کو گھر کی

گئے ہیں جب سے وہ اپنے بھی آئے غیر بھی آئے
سب آئے بھی گئے بھی گھر کی ویرانی نہیں جاتی

اور اس ویرانی کا احساس جنوں و دیوانگی کی وجہ سے بھی ہوتا ہے:

دشت وحشت میں ہوا تھا ساتھ جب مرحوم کا
مجھ سے مجنوں نے کہا تھا تو بڑا دیوانہ ہے
خراب و خستہ کہیں آج ہیں کہیں کل ہیں
پتا نہ پوچھ ہمارا، ہمارا کہیں قیام نہیں

ناطق جب کبھی اپنے وطن کی یاد میں کھوئے ہوئے نظر آتے ہیں تو دل میں ایک تڑپ اور کسک پیدا ہوتی ہے۔ اپنے اقربا کی جدائی اور اپنے بچوں کی موت کا صدمہ صفحۂ ذہن میں ابھرتا ہے اور پھر آنسوؤں میں ڈھل کر لفظوں کا روپ دھار لیتا ہے۔ سوز و گداز کی کیفیت ان شعروں میں ظاہر ہوتی ہے:

مدتوں بعد ملا حال وطن غربت میں
کوئی باقی نہ رہا ہم کو خبر ہونے تک

آہی جاتا ہے برے وقت میں اپنوں کا خیال
کوئی ہوتا ہمارا بھی تو پرسان ہوتا
رونے والوں کو تو تقدیر سے رو بیٹھے تھے
اے اجل کون ہمارے لیے گریاں ہوتا

ناطق ایک عظیم المرتبت شاعر تھے مگر دوسرے ادباء و شعراء کی طرح اپنے اہل وطن کی ناقدری کے شکار تھے۔ جس کا اظہار ان کی شاعری سے ہوتا ہے:

میں بھی کوئی چیز تھا لیکن نہ پہچانا مجھے
بندہ پرور، قدر ہی تم نے نہیں جانی مری
مضامین ہائے نو پیدا بہت ہو جائیں گے ناطق
مجھے یہ فکر ہے کہ پہلے پیدا قدرداں کرلوں

ناطق کی شاعری سہل ممتنع کی شاعری ہے۔ سادہ اور سلیس انداز میں شعر کہے ہیں۔ خود ناطق نے اپنے اشعار میں شعری رویے کے بارے میں واضح اشارے کئے ہیں:

شعر گوئی نئے انداز کی تجدید خیال
دیکھنا چاہے تو ناطق میرا دیوان اٹھا
شعر ہیں ناطق کے اب وارستہ انداز نظم
شاعری گم کردہ ہے، آواز بھرائی ہوئی
زبان داغ و شانِ ذوق کچھ اس میں نہیں ناطق
ارے یہ کیا ہے تو تو ہمنوائے نوح و سائل تھا

ممتاز ناقد علامہ نیاز فتح پوری نے ناطق کی شاعری کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار یوں کیا ہے:

> ''ناطق گلاؤٹھی تغزل کے دیرینہ گرفتار ہیں اور باوصف کسی خاص اسکول کے پابند نہ ہونے کے، ان کا انداز بیان ہمیں اساتذہ دہلی کی یاد دلاتا ہے۔ یہ معاملات حسن و عشق کو اس زبان میں ادا کرتے ہیں جو تغزل کے لحاظ سے معیاری چیز سمجھی جاتی ہے اور بعض اوقات یہ اپنے خیال کو ایسے پہلو سے پیش کرتے ہیں کہ سننے والا دفعتاً چونک پڑتا ہے۔ ان کے کلام میں ایک خاص تیکھا پن پایا جاتا ہے جو پرانی بات میں بھی نئی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ سلاست و روانی جو تغزل کی جان ہے، ان کے کلام میں ہر جگہ پائی جاتی ہے۔''

✪✪✪

جہانِ فکر و دانش

محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی

''یہ مضمون اس وقت کا ہے جب آتش جوان تھا۔ دل میں قرآنی علوم کی کچھ کرنیں بسی ہوئی تھیں، اب تو ذہن بھی تاریک ہے اور دل بھی ظلمت کدہ... یہ مضمون کس ساعت مسعود میں لکھا تھا یہ تو یاد نہیں۔ صرف اتنا پتہ ہے کہ لکھتے وقت قلم لرزاں و ترساں تھا اور میں، سینہ سوزاں، منفعل سر در گریباں تھا۔ دل میں وحشت تھی، غم تھا ایک صدی کی موت کا، ایک کائنات کے ارتحال کا۔ اسی غم کے لمحہ میں جو کچھ بھی لوح ذہن پر ابھرا وہ رقم کر دیا ہے۔''

مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کا تعلق اعظم گڑھ کی مردم خیز سرزمین سے ہے جو علماء صلحاء کا مرکز رہی ہے۔ میاں سید نذیر حسین دہلوی کے شاگرد رشید محدث کبیر مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری صاحب ''تحفۃ الاحوذی'' کا تعلق بھی اسی سرزمین سے ہے۔ علم حدیث کی دو اور عظیم ترین شخصیتیں مولانا عبیداللہ رحمانی مبارکپوری صاحب ''مرعاۃ المفاتیح'' اور مصطفے الاعظمی ''کتاب العلل'' کے مرتب، دراسات فی الحدیث النبوی کے مؤلف کا تعلق بھی اسی سرزمین سے ہے۔

مبادیات کی تعلیم مولانا نے دارالعلوم مئو میں حاصل کی۔ اس کے بعد ۱۳۳۴ھ میں فکر ولی اللٰہی کے پاسدار اور نقیب عربی مدرسہ دیوبند سے فراغت حاصل کی جس کی بنیادی غایت ہی درس حدیث اور فقہ حدیث ہے اور جس درس کا ڈاکٹر عبدالحلیم چشتی فاضل دیوبند کے بقول یہ امتیاز تھا کہ

''دارالعلوم میں درس حدیث کی اہم خصوصیت اور امتیازی شان طلبہ میں حدیث فہمی کا صحیح مذاق اور فقہ حدیث کا ملکہ راسخ پیدا کرتا ہے۔ (معارف اعظم گڑھ، اکتوبر ۱۹۶۷ء) تو ظاہر ہے کہ کچھ نہ کچھ تو قلب و ذہن پر ضرور اثر پڑے گا اور وہ بھی جب ایک ایسے شخص سے استفادہ کیا ہو جس کی حذاقت علمی کا ہر شخص معترف ہے۔ اس کے حلقے میں جو بھی آیا، آفتاب ماہتاب بن گیا۔ اس کی زلہ ربائی سے کتنے تاریک دل روشن ہو گئے اور کتنے ذہنوں کے دریچے کھل گئے۔ اس عظیم ترین شخصیت کا نام علامہ انور شاہ کشمیری ہے۔ ایک چلتا پھرتا کتب خانہ جن کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالحلیم چشتی نے کس قدر مبنی بر حقیقت بات کہی ہے کہ ''جن اہل علم نے اس خوان علم سے زلہ ربائی کی، وہ آسمان علم کے درخشاں ستارے بنے اور اس عہد کے اکابر علماء میں ان کا شمار ہوا۔ ان میں جو وسعت نظر پیدا ہوئی، وہ علامہ سید انور شاہ کشمیری کے حلقہ درس کا فیضان ہے۔ (معارف نومبر ۱۹۶۷ء) یہ علامہ انور شاہ کی نظر کی کرامت ہے کہ ان کے تلامذہ میں سے چراغ محمد پنجابی نے ''العرف الشذی'' لکھی تو مولانا محمد صدیق نجیب آبادی نے ''انوار المحمود'' بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی نے ''فیض الباری'' ترتیب دی تو ادریس کاندھلوی نے ''التعلیق الصبیح شرح مشکوۃ المصابیح'' مولانا محمد یوسف بنوری نے ''معارف السنن'' لکھا تو احمد رضا بجنوری نے ''انوار الباری شرح صحیح البخاری'' کے نام سے کئی جلدوں میں علامہ کے افادات کو مرتب کر ڈالا۔ انہی کے شاگرد مولانا مناظر احسن گیلانی نے 'تدوین حدیث' لکھ کر بہت سی غلط فہمیوں کے دروازے بند کر دیے۔ حجیت حدیث کو مبرہن کر کے فتنہ انکار حدیث کا مسکت جواب دیا۔ اسی سلسلۃ الذہب میں ایک اہم نام مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کا بھی ہے۔ جن کی ذات ستودہ صفات علمی دنیا میں محتاج متعارف نہیں ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے علامہ انور شاہ کشمیری کا ذکر کرتے ہوئے انہیں بھی 'دائرہ علم' سے تعبیر کیا ہے۔

علامہ کشمیری کے علاوہ انہیں مفتی عزیز الرحمٰن دیوبندی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا اصغر حسین سے شاگردی اور مولانا کریم بخش، عبدالغفار، شیخ سعید سنبل اور شیخ عبدالرحمٰن بھوپالی سے سند حدیث کا شرف حاصل ہے۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد مولانا اعظمی نے مظہر العلوم بنارس پھر دارالعلوم مئو اور مفتاح العلوم مئو میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے تدریسی خدمات انجام دیں۔ اس دوران ہزاروں طالب علموں نے آپ سے استفادہ کیا۔ اسکے علاوہ دنیائے عرب کے علمی اسفار میں بہت سے لوگوں نے سند حدیث حاصل کرنے کی سعادت پائی۔ شیخ عبدالفتاح ابو غدہ، شیخ اسماعیل الانصاری دارالافتا (ریاض) شیخ حماد الانصاری، شیخ حمدی عبدالمجید (بغداد) کے نام خاصے مشہور ہیں۔ ان کے ہندوستانی تلامذہ میں

شمیم طارق صاحب نے یہ چند نام گنوائے ہیں۔ مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا محمد حسین بہاری، شیخ الحدیث مولانا عبدالستار اعظمی، شیخ الحدیث مولانا عبدالجبار مئوی، شیخ الحدیث محمد سلیمان اعظمی، فاضل جلیل مولانا ظفیر الدین اور الاستاد مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ایڈیٹر البعث الاسلامی لکھنؤ (بلٹز ۲۱رفروری ۱۹۹۱ء)

مولانا اعظمی دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن بھی رہے۔ انہوں نے جو علمی خدمات انجام دی ہیں اس کی بنیاد پر ۳۱ر مارچ ۱۹۸۶ء کو سابق صدر جمہوریہ ہند گیانی ذیل سنگھ نے راشٹر پتی بھون میں منعقدہ ایک خصوصی تقریب میں عربی کا سند اعزاز بھی عطا کیا، میری دانست میں حلقہ دیوبند کی یہ تیسری اہم شخصیت ہیں جنہیں اس اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔ ان سے پہلے ڈاکٹر مصطفےٰ حسن علوی کو ۱۹۶۰ء میں اور مولانا قاضی سجاد حسین (م ۱۹۹۰ء) کو ۱۹۶۷ء میں پریسیڈنٹ ایوارڈ ملا اور اب دیوبند کے فیض یافتگان میں ڈاکٹر بدرالدین الحافظ، پروفیسر زبیر فاروقی، انظر شاہ کشمیری کے نام اس فہرست میں بھی شامل ہوگئے ہیں۔

مولانا اعظمی کو اسماء الرجال پر مکمل عبور حاصل تھا جس کی اہمیت وقدر و قیمت کے تعلق سے ڈاکٹر اشپر نگر نے یہ کہا تھا کہ ''کوئی قوم دنیا میں ایسی نہیں گزری، نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال کا عظیم انسانی فن ایجاد کیا ہو۔ جس کی بدولت آج پانچ لاکھ اشخاص کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔'' (سید سلیمان ندوی، خطبات مدارس ص:۴۴) یہ بہت ہی مشکل فن ہے، اس کے ضابطے بھی بہت دشوار ہیں، اس کی ایک شاخ علم جرح و تعدیل بھی ہے۔ اس کے لیے وسعت معلومات، تذکر، اتقان اور ضبط اور مختلف علوم وفنون میں جس مہارت کی ضرورت ہے، وہ مولانا میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ اس سلسلے کی چند اہم کتابوں میں طبقات ابن سعد، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (عمر بن عبدالبر الاندلسی)، اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ (ابن الاثیر) الاصابہ فی تمیز الصحابہ (ابن حجر عسقلانی) لسان المیزان، تہذیب التہذیب (ابن حجر) طبقات الحفاظ (جلال الدین سیوطی) ہیں۔ ہندوستان میں بھی مشارق الانوار کے مصنف حسن صنعانی نے درالصحابہ اور عبدالحق محدث دہلوی نے ''الاکمال فی اسماء الرجال'' محمد بن طاہر بن علی پٹنی گجراتی نے ''المغنی فی ضبط اسماء الرجال'' شیخ عبدالوہاب شافعی مدراسی نے ''اکمل الوسائل لرجال الشمائل'' لکھ کر اس فن کی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ مولانا اعظمی کی خدمات کو ان اسلاف کے کارناموں کی توسیع اور تفریع قرار دیا جاسکتا ہے۔

مولانا نے حدیث کی اہم اور قدیم کتابوں کو مدون کر کے علمی دنیا کو اس سے متعارف کرایا ہے۔ اس پہ جو تعلیقات لکھی ہیں، وہ ان کی علمی جلالت کی گواہی دیتی ہیں۔ ان کی تمام تر کتابیں، مرتبات،

مدونات، وسعت علمی اور رسوخ فی العلم کی مظہر ہیں۔ ذیل میں چند مدونات کا اجمالی جائزہ پیش ہے۔
(۱) استدراک وتعلیق شرح مسند امام احمد بن حنبل— یہ شرح مسند بن حنبل علامہ احمد محمد شاکر پر محدثانہ تنقید ہے۔ جسے بقول شمیم طارق ''مصنف نے ان تنقیدوں کو اظہار تشکر کے ساتھ نہ صرف قبول کیا بلکہ اپنی کتاب کی پچیسویں جلد میں حضرت محدث الاعظمی کی ''فضیلت علمی'' اور ''علوم حدیث'' میں آپ کی مہارت کے ساتھ شامل بھی کیا ہے۔
(شمیم طارق، ستارہ جو آفتاب بن گیا، بلٹز بمبئی، ۲؍فروری ۱۹۹۱ء)
(۲) تحقیق وتعلیق مسند حمیدی— ابوبکر عبداللہ بن زبیر بن عیسیٰ اسدی حمیدی مکی جو امام سفیان بن عیینہ کے شاگرد اور امام محمد بن اسماعیل بخاری کے استاد ہیں، ان کی کتابوں میں سے ایک کتاب ''المسند'' بھی ہے۔ جس کی روایت ان کے دو تلامذہ بشر بن موسیٰ اسدی اور ابو اسماعیل سلمی نے کی ہے۔ مولانا اعظمی نے بشر بن موسیٰ کے روایت کردہ مخطوطے کی ترتیب وتدوین کی ہے جو مجلس علمی ڈابھیل سے شائع ہوئی۔ یہ تصنیفی ادارہ مولانا محمد بن موسیٰ افریقی، فاضل دیوبند نے قائم کیا تھا جو انگریزی، فرانسیسی زبان کے نہ صرف ماہر تھے بلکہ جوہانسبرگ افریقہ میں اسلامی انسٹی ٹیوٹ کے بانی بھی تھے۔ شوق نیموی کی ''آثار السنن'' حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کے حواشی کے ساتھ اور علامہ زیلعی کی ''نصب الرایہ'' اور علامہ کشمیری کی ''فیض الباری'' کی اشاعت بھی اسی مجلس علمی کی مرہون منت ہے۔ قاضی اطہر مبارکپوری نے اس کتاب کے متعلق یہ لکھا ہے کہ ''مولانا کو اس کے چار قلمی نسخے مل سکے تھے۔ ایک کتاب خانہ دارالعلوم دیوبند میں، جو تیرہ سو چوبیس ہجری کا مکتوبہ تھا۔ دوسرا کتب خانہ سعیدیہ حیدرآباد میں جو ۱۳۱۱ھ میں لکھا گیا تھا۔ تیسرا کتب خانہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں جو ۱۲۹۰ھ کا مکتوبہ تھا۔ چوتھا دارالکتب الظاہریہ دمشق میں جو مائیکروفلم کے ذریعے مسند حمیدی کی طباعت کے دوران ملا اور مولانا نے اس سے بھی استفادہ کیا۔ ویسے دیوبندی اور سعیدی نسخوں کو اصل قرار دے کر کتاب کی تصحیح وتعلیق کی ہے۔ (مآثر ومعارف، ص:۲۰۶)
مولانا نے اس کتاب میں احادیث کی تخریج کے ساتھ طرق اسانید اور غریب الفاظ کی تشریح بھی کی ہے۔ مسانید صحابہ کی ترتیب وار فہرست کے ساتھ فقہی ترتیب کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ اعلام والامکنہ کی بھی ایک فہرست ہے۔ ۵۴۶ صفحات پر محیط دو جلدوں کی اس کتاب میں تیرہ سو احادیث ہیں جن میں زیادہ مرفوع ہیں۔ یہ مولانا کا بڑا عظیم کارنامہ ہے۔ قاضی اطہر مبارکپوری کے خیال میں ''مولانا نے اس نادر و نایاب کتاب کی تعلیق وتحقیق اور تصحیح میں موجودہ طرز کی آسانیوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بڑی دقت نظر سے کام لیا ہے۔'' (مآثر ومعارف ص:۲۰۸)

(۳) تعلیق وتحقیق کتاب الزہد والرقائق — عبداللہ بن مبارک کا شمار دوسری صدی ہجری کے ممتاز محدثین میں ہوتا ہے۔ انہیں کی یہ کتاب ''الزہد والرقائق'' ہے۔ جو مخطوطے کی شکل میں چند کتب خانوں میں محفوظ تھی۔ مولانا اعظمی نے اس کتاب کو ایڈٹ کر کے شائع کیا۔ یہ گیارہ اجزاء پر محیط ہے اور اس میں سولہ سو سینتیس (۱۶۳۷) احادیث ہیں جو مروزی سے مروی ہیں۔ اس کے علاوہ چار سو چھتیس (۴۳۶) نعیم بن حماد کی روایت کو بطور زیادات شامل کیا گیا ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا ضیاء الدین اصلاحی لکھتے ہیں کہ ''فاضل جلیل مولانا حبیب الرحمان اعظمی نے جو اس سے پہلے بھی حدیث کی بعض اہم کتابوں کو ایڈٹ کر چکے ہیں، اب اس کتاب کو مختلف نسخوں کی مدد سے مقابلہ اور تعلیق وتحشیہ کے بعد شائع کیا ہے۔ شروع میں ایک جامع اور مبسوط مقدمہ ہے۔ جس میں زہد کی حقیقت اور چھٹی صدی ہجری تک اس موضوع پر لکھی گئی کتابوں کا تذکرہ، مصنف کتاب کے مفصل حالات، علمی و دینی کمالات کے علاوہ اس کتاب کی اہمیت، اس کے تین مختلف نسخوں اور ان کے رُوات کے مختصر ترجمے اور دوسری مفید معلومات تحریر کی گئی ہیں۔ حواشی وتعلیقات میں اختلاف نسخ، آیتوں کے حوالے، رجال و اسناد کی تحقیق، مشکل وغریب الفاظ اور مشکلات کی تشریح دوسری معروف ومشہور ومتداول کتابوں کی حدیثوں کی تخریج، اس کے مرویات کی ان سے مطابقت اور اختلاف کو ظاہر کر کے ان کی صحت وخطا کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ (معارف اعظم گڑھ ۱۹۶۷ء)

(۴) تعلیق وتحقیق سنن سعید بن منصور — امام سعید کبار محدثین میں سے ہیں۔ امام مالک اور لیث بن سعد کے شاگرد امام احمد حنبل، امام بخاری، امام مسلم، امام ابو داؤد کے استاد، ثقہ اور متقن ہیں۔ انہیں کی ''کتاب السنن'' ہے جو اس درجہ مشہور ہوئی کہ امام سعید ''صاحب السنن'' کے لقب سے مشہور ہوئے۔ یہ ان کے دو تلامذہ محمد بن علی بن زید صائغ اور احمد بن نجدہ ابن عرفان سے مروی ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ کی کوششوں سے کتب خانہ محمد پاشا کوپریلی سے اس کی تیسری جلد دستیاب ہوئی جو مولانا اعظمی کی تصحیح کے ساتھ شائع ہوئی۔ دستیاب تصنیف کی روایت محمد بن علی سے ہے۔ قاضی اطہر مبارکپوری نے اپنے مجموعہ مضامین ''مآثر ومعارف'' میں اس کتاب کا تفصیلی تعارف پیش کیا ہے۔

(۵) تعلیق وتحقیق مصنف عبدالرزاق — امام عبدالرزاق بن ہمام صنعانی حمیدی، ممتاز محدث ہیں۔ ان کے اساتذہ میں جہاں ابن جریج، امام اوزاعی، سفیان ثوری، امام مالک، سفیان بن عیینہ جیسے مشاہیر شامل ہیں۔ وہیں تلامذہ میں اسحاق بن راہویہ، امام احمد، علی بن مدینی، یحیٰی بن معین جیسے اہم نام ہیں۔ انہی کی ایک اہم کتاب ''مصنف'' بھی ہے جس کی ترتیب فقہی ابواب کے مطابق ہے۔ مُصنّف کے مجموعوں میں مصنف ابن ابی شیبہ کے بعد سب سے زیادہ مشہور یہی ہے۔ اس کی اکثر

روایتیں ثلاثی ہیں۔ یہ کتاب مولانا کی تعلیق وتحقیق کے ساتھ گیارہ ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

ان کے علاوہ مولانا کی تعلیقات کے ساتھ جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان کے نام یوں ہیں:

الترغیب والترہیب لابن حجر، تلخیص جامع الاصول لطاہر پٹنی، تعلیق المطالب العالیہ لابن حجر، تعلیق کشف الاسفار عن زوائد مسند البزار، تعلیق کتاب الشفاف لابن شاہین، تعلیق مصنف لابن ابی شیبہ — ان تمام مدونات کے مطالعے سے جہاں مولانا کے تبحر علمی، رسوخ فی العلم، اتقان وتثبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہیں یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ تحقیق وتدوین ایک دشوار گزار مرحلہ ہے۔ دنیا کے کس کتب خانے میں کس کتاب کا کون سا نسخہ ہے۔ کون صحیح ہے کون غلط؟ کس کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور کس سنہ کا نسخہ ہے؟

یہ ساری باتیں جس دقت نظری اور باریک بینی کی متقاضی ہیں اس کے لیے مخصوص ذہن و دماغ ہوتے ہیں۔ مولانا بھی انہی چندلوگوں میں سے تھے جنہیں خدا نے اس کام کے لیے منتخب کیا اور بھرپور قوت وصلاحیت ودیعت کی۔ کوئی بھی انسان علمی عظمت کے سدرۃ المنتہیٰ تک نہیں پہنچ سکتا ہے اور نہ ہی کسی کی بات حرفِ آخر ثابت ہوسکتی ہے۔ ہاں اعتبار و استناد کے دائرے میں بہت سارے لوگ ہیں، انہی میں سے ایک مولانا کی بھی شخصیت ہے۔ جنہوں نے اپنی علمی عظمتوں کے نشان زمانے میں چھوڑے ہیں اور تحقیق کا ایک بلند معیار قائم کیا ہے اور جو کام متنی تحقیق وتنقید کی دنیا میں قاضی عبدالودود اور امتیاز علی عرشی نے انجام دیا ہے، اس سے زیادہ محنت طلب کام مولانا کا ہے۔ ان کی تصانیف سے کارل بروکلمان کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔

تدوین وتحقیق کے علاوہ مولانا نے بہت کچھ لکھا اور اس قدر لکھا کہ اس کے پڑھنے کے لیے ایک عمر درکار ہے اور تفہیم کے لیے ذہنی پختگی اور گہری بصیرت۔ مقتدر مجلات میں علم حدیث سے متعلق جو بھی مضامین چھپے، اس کے متعلق اپنی رائے اور اپنے محاکمے سے انہوں نے پوری علمی دنیا کو متوجہ کیا اور جس قدر وسعت علمی کا ثبوت دیا اس سے دنیا واقف ہے۔ اس سلسلے میں یہ تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ مجلّہ معارف اعظم گڑھ دسمبر ۱۹۶۰ء میں قاضی رشید کی کتاب ''التحف والذخائر'' کے متعلق اسلامیات کے دو ممتاز افاضل ڈاکٹر حمید اللہ اور قاضی اطہر مبارکپوری کے درمیان ایک بحث چھڑ گئی جس میں قاضی صاحب کا مدعیٰ یہ تھا کہ اس کتاب کے مصنف کا تعلق چھٹی صدی ہجری سے ہے اور ان کا تذکرہ ابن خلکان کی ''وفیات الاعیان'' میں ہے۔ جب کہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا کہنا تھا کہ مصنف کا تعلق پانچویں صدی ہجری سے ہے جیسا کہ کتاب کی اندرونی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے اور وفیات میں جن کا ذکر ہے یہ ان کی کتاب نہیں ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے بطور

محاکمہ ایک مضمون ــــ ''الذخائر والتحف'' کس کی تصنیف ہے، کے عنوان سے لکھا جو مجلّہ معارف اعظم گڑھ کے ماہ فروری ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔ جو ان کی علمی بصیرت کا غماز بھی ہے اور متوازن، محتاط رائے کا مظہر بھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے اس کے مصنف قاضی رشید کی نسبت مقدمہ میں لکھا ہے کہ وہ پانچویں صدی ہجری کے عالم تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے قاضی اطہر مبارکپوری نے معارف دسمبر ۱۹۶۰ء میں اپنی یہ تحقیق لکھی کہ قاضی الرشید بن زبیر کا تفصیلی ذکر ''تاریخ ابن خلکان'' میں موجود ہے اور وہ پانچویں نہیں چھٹی صدی ہجری کے ایک جامع الفنون عالم تھے۔ قاضی صاحب کا یہ بیان حرف بہ حرف صحیح ہے۔ بلکہ قاضی الرشید کا تفصیلی ذکر ''ابن خلکان'' کے علاوہ یاقوت کی ''معجم الادباء'' یافعی کی ''مرأۃ الجنان'' اور ابن حماد حنبلی کی ''شذرات الذہب'' وغیرہ میں موجود ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ''الذخائر والتحف'' انہی قاضی الرشید کی تصنیف ہے۔ جن کا ذکر کتب مذکورہ بالا میں ہے۔ یا کسی دوسرے قاضی الرشید کی۔ قاضی اطہر صاحب کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسے انہی کی تصنیف مانتے ہیں۔ قاضی صاحب کے خیال کی کیا بنیاد ہے اس کو انہوں نے ظاہر نہیں کیا اور نہ اپنے خیال کی تائید میں انہوں نے کوئی دلیل پیش کی۔ اس کے برخلاف ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا خیال ہے کہ کتاب ابن خلکان والے قاضی الرشید کی نہیں بلکہ ان کے دادا کی ہے اور ڈاکٹر صاحب نے اپنے خیال کی تائید میں خود اس کتاب کی اندرونی شہادتیں پیش کی ہیں۔''

ان کی اندرونی شہادتوں کا جائزہ لینے کے بعد مولانا نے بہت ہی مدلل اور مبرہن انداز میں اپنی رائے یوں پیش کی:

> ''اس بحث میں اپنی رائے پیش کرنے سے پہلے میں یہ بتا دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ جن تین شخصیتوں کا لقب القاضی الرشید بتایا گیا ہے وہ تینوں معروف ہیں۔ ایک تو وہی ابن خلکان والے القاضی الرشید ہیں جن کا نام احمد ہے۔ دوسرے ان کے والد علی ہیں اور تیسرے ان کے دادا ابراہیم ہیں۔ ان دونوں کا تذکرہ ہمارے دونوں فاضلوں کو نہیں مل سکا ہے۔ حالانکہ ان دونوں کا ذکر موجود ہے۔''

آخر میں انہوں نے ڈاکٹر حمید اللہ کی رائے کو قرین صواب بتایا ہے اور جس انداز سے اس کی توجیہ کی ہے، اس سے دونوں ہی مطمئن ہو گئے۔ یہ مضمون افادیت سے نہ صرف مملو ہے بلکہ بحر تحقیق میں غوطہ لگانے والوں کے لیے رہنما بھی ہے۔ قاضی اطہر صاحب نے مآثر و معارف میں مولانا کے اس مضمون کو شامل کیا ہے۔

اسی طرح مجلہ معارف اگست ۱۹۶۷ء میں مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے مضمون ابوعبید قاسم بن سلام پہ ایک مضمون لکھتے ہوئے جس علمی بصیرت کا ثبوت دیا ہے واقعہ یہ ہے کہ یہ انہی کا حصہ ہے۔ جس میں انہوں نے وضاحت کی کہ ''کتاب الاموال'' کے علاوہ ابوعبید کی ''غریب الحدیث'' بھی چھپ گئی ہے اور اس کی اشاعت کا شرف دارالمعارف العثمانیہ حیدرآباد کو ہے۔ وہیں اس نادر و نایاب کتاب کے متعلق اپنی معلومات کا دریا یوں بہایا:

''علمائے دائرہ نے اس کتاب کو چار مخطوطوں کی مدد سے ایڈٹ کیا ہے۔ ایک مخطوطہ مدرسہ محمدیہ مدراس کا ہے۔ اس کو اصل قرار دیا گیا ہے۔ دوسرا رضا لائبریری رامپور کا ہے۔ تیسرا لیڈن اور چوتھا مکتبہ ازہریہ مصر کا ہے۔ مؤخر الذکر تینوں مخطوطے باسند ہیں۔ یعنی کتاب میں جن احادیث و آثار کے ٹکڑے نقل ہوئے ہیں، ساتھ ساتھ ان کی سند بھی مذکور ہے۔ برخلاف مخطوطہ مدراس کے کہ اس میں تمام سندیں حذف کردی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ جگہ جگہ عبارتوں میں اختصار اور الفاظ کا تغیر و تبدل بھی پایا جاتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ مدراسی نسخہ جس کو اصل قرار دیا گیا ہے وہ بعینہٖ غریب الحدیث نہیں ہے بلکہ اس کی تجرید و اختصار ہے۔ اس صورت حال کا تقاضا تھا کہ مدراسی نسخے کے بجائے رامپور یا مصر یا لیڈن کے مخطوطے کو اصل قرار دیا جاتا اس لیے کہ فی الحقیقت غریب الحدیث لابی عبید کے نسخے یہی ہیں اور اگر کوئی مجبوری حائل تھی تو ظاہر کردیا جاتا کہ ہم غریب الحدیث کی تجرید کو خاص اسباب کی بنا پر اصل قرار دے رہے ہیں۔ لیکن ہم التزام کریں گے کہ تجرید و اختصار کرنے والوں نے جتنی سندیں اور الفاظ کم کردیے ہیں ان کو تعلیقات میں درج کردیں گے۔ اگرچہ علمائے دائرہ نے عملاً ایسا ہی کیا ہے کہ چھوٹی چھوٹی چیزیں تعلیقات میں لے لی ہیں۔ مگر اصل کی نسبت یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ تجرید ہے اور تعلیقات میں جو استدراک کئے ہیں، ان کو رامپور یا مصری نسخے کی زیادات سے تعبیر کیا ہے۔ حالانکہ وہ زیادات نہیں ہیں۔ بلکہ اصل کتاب کے اجزاء ہیں۔'' (معارف اکتوبر ۱۹۶۷ء)

اس مضمون میں مولانا نے مدینہ منورہ کے دو نسخوں کے حوالے سے اپنی مدلل بات پیش کی ہے اور مطبوعہ نسخے کے اغلاط کی نشان دہی کی ہے۔

مولانا نے بعض اختلافی نزاعی مسائل پر بھی کتابیں لکھی ہیں مگر ان کا انداز انتہائی محققانہ اور سنجیدہ ہے، جارحانہ نہیں۔ ان کی تحریریں جذباتیت سے مملو نہیں ہیں۔ اور نہ ہی انہوں نے سب وشتم

اور طعن و تشنیع کے ذریعے، غیر مہذب اور ناشائستہ حرکت کا ارتکاب کیا ہے۔ ان کے پیش نظر کسی خاص مسلک کی وکالت نہیں بلکہ افہام وتفہیم کا جذبہ رہا ہے۔ جبکہ بیشتر لوگوں کے پیش نظر مسلکی بالادستی اور تفوق کا جذبہ یا داعیہ ہوتا ہے جسے وہ اپنی فہم میں ابطال باطل یا احقاق حق کا نام دیتے ہیں مگر مولانا نے ایسا رویہ اختیار نہیں کیا۔ فروعات یا جزئیاتی مسائل میں اختلافات بری چیز نہیں ہیں مگر اختلافات جب واہیات کے دائرے میں آجائیں تو یہ انتہائی ناجائز اور ناشائستہ عمل بن جاتا ہے۔ اس سے اخوت اسلامی کا وسیع ترین تصور جہاں مجروح ہوتا ہے۔ وہیں یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ فروعات میں الجھنا نہ تو مقتضائے قرآن و حدیث ہے اور نہ ہی روح عصر سے ہم آہنگ۔ اختلاف امت یقیناً رحمت ہے مگر اس حد تک کہ زبان و بیان سے کردار وگفتار سے کسی دوسرے کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچے۔ اختلافات تنازعات اگلے وقت کے لوگوں میں بھی تھے مگر ان میں وضع داری تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اختلافی مسائل پر کچھ لکھنے کے لیے جس ملکہ راسخہ اور فہم و ادراک کی ضرورت ہوتی ہے اس سے موجودہ دور کے چھوٹ بھیے علماء اور فتنہ پرور فضلا محروم ہیں۔ ان کی تحریریں کاغذ، پیسوں اور وقت کا زیاں ہیں اور اس طرح کی اختلافی کتابیں نذر آتش یا کوڑے دان میں پھینکے جانے کے قابل ہوتی ہیں۔

اختلافی مسائل پر کبار علماء دیوبند نے بھی کتابیں لکھیں مگر اس درجہ محققانہ ہیں کہ کم استعداد مولویوں کی فہم و ادراک سے بالاتر ہیں۔ علامہ انور شاہ کشمیری نے جب ایک کتاب ''فصل الخطاب فاتحہ خلف الامام'' لکھی تو مولانا سید اصغر حسین دیوبندی نے یہ اشتہار دیا کہ بڑے بڑے علماء ہی مشکل سے سمجھتے ہیں۔ کم استعداد مولوی طلب نہ فرمائیں۔ مولانا اعظمی بھی چونکہ ان کے حلقہ تلامذہ میں ہیں، اس لیے ان کی تحریروں میں بھی حد درجہ سنجیدگی، متانت، وقار اور حکمت پائی جاتی ہے۔ اختلافی مسائل پر ان کی مشہور کتابوں میں ''رکعات التراویح'' اور ''الاعلام المرفوعہ'' ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ بالخصوص اختلافی اور نزاعی مسائل پر لکھنے والوں کے لیے یہ ناگزیر ہیں۔

✪✪✪

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

جب میں بہت چھوٹا سا تھا ''القراۃ الراشدہ'' میرے نصاب میں شامل تھی۔ اس کتاب پر ایک نام خوبصورت پکی روشنائی میں چمکتا ہوا نظر آتا تھا، وہ نام تھا سید ابوالحسن علی الندوی کا۔ اس وقت میرے ذہن میں ان کے بارے میں یہ تصور تھا کہ کوئی فلکی شخص ہوگا جس کا اس عالم کون و مکاں سے کوئی تعلق نہیں اور یہ کتاب بھی آسمان سے اتری ہوگی۔ پھر ایک دن میرے استاد محترم مولانا محمد طیب خان مرحوم نے بتایا کہ اس کتاب کے مصنف بھی ہماری طرح انسان ہیں اور لکھنؤ میں رہتے ہیں۔ مجھے ایک لمحے کو حیرت ہوئی کہ وہ ہماری طرح کے انسان ہیں اور پھر بھی اتنی بڑی کتاب... مجھے اب ان کے ساتھ ساتھ لکھنؤ کی قسمت پہ رشک آنے لگا۔ میں سوچنے لگا یا الٰہ وہ کیسی بستی ہوگی جہاں یہ ہستی قیام کرتی ہے۔

رفتہ رفتہ عقل و شعور کی سطحیں بڑھتی رہیں۔ شخصیات اور شہروں سے معصوم آنکھوں کے رشتے استوار ہونے لگے تو دھند بھی چھٹنے لگے۔ سورج کی طرح اشیا روشن ہونے لگیں اور ذہن کو یہ عارضہ لاحق ہوگیا کہ ہر بڑی چیز اب چھوٹی نظر آنے لگی۔ عقیدتوں کے شجر سے ہرے بھرے پتے بھی گرنے لگے۔ عظمتوں کے موسم پر خزاں چھانے لگی۔ رفعتوں کے مینار نظروں سے اوجھل ہونے لگے مگر اس کیفیت میں بھی ایک شخصیت میرے ذہن کے جبل مرتفع پر ایک شاہین کی طرح بسیرا کیے رہی اور وہ مولانا علی میاں کی ذات ستودہ صفات تھی۔ میرا خیال ہے کہ کائنات کی آنکھیں چاہے کتنی

وسیع ہو جائیں یا سمٹ کر کسی ایک نقطے پر ٹھہر جائیں مگر اس ایک نقطے میں بھی علی میاں کے علم کا نور ضرور نظر آئے گا۔

مولانا کی شخصیت صاحبقرانی تھی۔ وہ ایک درۂ یکتا تھے، گوہر نایاب، جس نے سمرقند و بخارا، دمشق و بغداد، اسکندریہ و قاہرہ، شیراز و اصفہان کی مٹی سے جنم نہیں لیا تھا بلکہ اس ہندوستان کی مٹی سے جنم لیا جس کے سپوتوں نے عرب کی مقدس سرزمین میں جنم لینے والے دانشوروں کی بھی فکری قیادت کی۔

دیوبند کے فیض یافتہ مولانا ابوالحسن علی ندوی اس کی ایک تابندہ مثال تھے۔ انہوں نے مشرق وسطٰی اور خطہ عرب میں اسلام کی تبلیغ کی اور سچ کہیے تو اس صدی میں وہ پوری دنیا میں اسلام کی تہذیبی، لسانی اور ثقافتی شناخت کا ایک نمایاں حوالہ تھے۔ ربّ ذوالجلال نے انہیں قلب منقلب مع الحق اور لسان متحلی بالصدق ودیعت فرمایا تھا۔ اس لیے وہ ہمیشہ سچے شبد لکھتے رہے۔ سچے شبد بولتے رہے۔ ان کی کسی بھی تحریر یا تقریر میں مداہنت کا کوئی شائبہ تک نہیں۔ ان کی ہر ایک کتاب ایک خزانۂ عامرہ ہے۔ ایک بیش قیمت تحفہ۔ دنیا کی کوئی قیمتی سے قیمتی شے اس کی متبادل نہیں ہوسکتی۔

مولانا نجیب الطرفین تھے۔ اصلاً حسنی و حسینی سید اور اس خانوادے کے چشم و چراغ تھے جس نے ہندوستان کی عظمتوں اور رفعتوں سے ایک جہاں کو آشنا کرایا۔ جس نے اس سرزمین کے شمس و قمر کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر عالم عرب سے متعارف کرایا اور ایک ایسی سوانحی لغت تیار کی جس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ ان کے والد مبرور و مغفور مولانا عبدالحی حسنی کی کتاب آٹھ ضخیم جلدوں پر محیط ''نزہتہ الخواطر'' اور ''گل رعنا'' کو کوئی بھی ادبی تاریخ فراموش نہیں کر سکتی۔

سید ابوالحسن علی ندوی، اپنے والد مبرور کی علمی و ادبی روایت کے سچے امین اور وارث تھے۔ انہوں نے بھی ہندوستانی علوم و فنون میں اپنے والد مغفور کی طرح اضافے کیے اور پوری دنیا کو ایسی ایسی کتابیں دیں کہ دنیا آج بھی مولانا کی شخصیت پر غبطہ کرتی ہے۔ دینی علوم و معارف کا وہ کون سا پہلو ہے جو مولانا کی نظر سے مخفی رہا ہو۔ تصوف، تاریخ، تہذیب، ثقافت، ادب، عصری اسلامی موضوعات، مولانا نے کس موضوع پر نہیں لکھا اور اس کا حق ادا نہیں کیا۔

''تاریخ دعوت و عزیمت'' اپنی نوعیت کی ایک ایسی کتاب ہے جسے لکھنے کے لیے صدیوں کی ریاضت درکار ہے مگر مولانا نے اس طرح کی بہتیری کتابیں لکھیں اور ان کتابوں نے بہتوں کی ذہنی دنیا کو بدل ڈالا۔ صاحب نظر ہو تو ایسا... ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر'' ان کی

اہم ترین کتاب ہے جس نے اہل عرب کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا۔ اسی طرح ''سیرت احمد شہیدؒ ہو یا 'المرتضیٰ'، 'پاجا سراغ زندگی' ہو یا 'کاروانِ زندگی' یہ ایسی کتابیں ہیں جنہیں وقت کی تاتخی گردشیں کبھی نہیں مٹا سکتیں۔ 'کرالغد اۃ' اور 'مرالعشی' بھی اس کی رونق کو ماند نہیں کر سکتے۔

علی میاں، عربی زبان و ادب کے صاحب طرز ادیب تھے اور ان کی عظمت کا نقش عرب کے بڑے بڑے فصحاء و بلغاء کے ذہنوں پر قائم ہے۔ سید قطب ہوں یا انور الجندی، علی طنطاوی ہوں یا یوسف القرضاوی، شکیب ارسلان ہوں یا ناصر الدین البانی، شکری فیصل ہوں یا شیخ عبدالعزیز رفاعی، سبھی علی میاں کی فصاحت و بلاغت لسانی کے اسیر ہیں۔

مولانا علی میاں اردو کے بھی ایک صاحب طرز انشا پرداز تھے۔ وہ کون سی صنف ہے جس میں مولانا ابوالحسن ندوی نے اشہبِ قلم نہیں دوڑائے۔ کون سا ایسا موضوع ہے جسے ان کا قلم چھوکر نہ گزرا۔ انہوں نے سفرنامے لکھے تو ایسے کہ ابن بطوطہ اور ابن جبیر کی یاد تازہ ہو جائے اور خاکے لکھے تو ایسے کہ کیا کوئی اردو کا سقراط و بقراط لکھے گا اور خودنوشت لکھی تو ایسی کہ پڑھنے والے کے دل میں ویسی ہی زندگی جینے کی تمنا جاگ اٹھے۔

مولانا علی میاں، نام نہاد ماہرین اقبالیات سے کہیں زیادہ بڑے اقبال شناس تھے۔ اقبالیات کے ضمن میں ان کا جو کارنامہ ہے، وہ لازوال ہے۔ اقبال کے افکار کی تفہیم صحیح معنوں میں وہی کر سکتا ہے جس کی جڑوں میں اسلامی فکری روایت بھی شامل ہو۔ جو اسلام کے متحرک، انقلابی عناصر کو سمجھتا ہو۔ جس نے اسلام کا کلی طور پر مطالعہ کیا ہو۔ جو اسلام کے بدایہ ونہایہ سے واقف ہو۔ جسے مبدا و معاد کی خبر ہو۔ علامہ اقبال کی فکری شخصیت کو مولانا نے ہی صحیح تناظر میں سمجھا اور عرب دنیا کے سامنے ان کے افکار اس طرح پیش کیے کہ عالم عرب بھی علامہ اقبال کا دالہ وشیدا ہو گیا۔ پھر عبدالوہاب عزام اور صاوی علی شعلان نے اقبال شناسی کے دائرے کو اتنی وسعت بخشی کہ عرب کی فضاء اقبال کے نغموں سے گونجنے لگی۔ از ساحل نیل تا بخاک کاشغر اقبال کے مسجد قرطبہ کی سمفنی گونجتی رہی۔ مرحوم رشید احمد صدیقی نے مولانا کی اقبال شناسی کا اعتراف کرتے ہوئے کس قدر بلیغ رمز استعمال کیا ہے:

> ''مولانا پہلے عالم دین ہیں جس نے موجودہ صدی کی اردو شاعری کے سب سے بڑے نمائندہ اور عظیم شاعر اقبال کی شخصیت اور شاعری کا مطالعہ غیر معمولی شوق اور بصیرت سے کیا ہے۔ ورنہ بیشتر علماء ہر جدید کو بالعموم مشتبہ۔ ورنہ بڑی احتیاط سے

دیکھنے کی طرف مائل رہے ہیں۔''

دراصل اقبال کے شاہین یعنی انقلاب وتحرک کے استعارہ کو مولانا نے ہی اس کی مکمل معنویت کے ساتھ سمجھا اور اپنی تحریروں میں پیش کیا۔ ان کی ہر تصنیف میں یہ شاہین زیریں سطح پر ضرور موجود ہوتا ہے۔''نقوشِ اقبال'' ایک ایسی کتاب ہے جو اقبالیات پر محض ایک اضافہ نہیں بلکہ اقبال شناسی میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اقبال کے جملہ فکری عناصر کی تفہیم کا حق انہوں نے ادا کر دیا اور ایسا مولانا ہی کر سکتے تھے کہ وہ مواہب لدنیہ سے معمور تھے۔

علامہ اقبال کی طرح مولانا ابوالحسن علی ندوی بھی مغربی طوفان کے لیے ایک چٹان کی مانند تھے۔ مولانا کی شخصیت میں مشرقی تہذیب، ثقافت اور علوم کی جڑیں بہت مضبوط تھیں اور انہیں مشرقی تہذیب وثقافت کی رفعت اور عظمت پر اتنا یقین تھا کہ مغرب کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ مغربیت اور مادیت پرستی کے خلاف مولانا نے قلمی جہاد ہی نہیں بلکہ عملی جہاد بھی شروع کر دیا تھا۔ مولانا جانتے تھے کہ مغربی تہذیب کی یلغار، مشرق کے فکری ایوانوں کو تہس نہس کر دے گی۔ اس لیے انہوں نے مکمل مزاحمت اور مقاومت کے ساتھ مغربی تہذیب کے خلاف لکھا اور عالم عرب کو بھی اس تہذیب کے دلدل سے نکالا۔

مولانا کا ادبی ذوق انتہائی شستہ اور شائستہ تھا۔ ادب کا باضابطہ مطالعہ ان کے روزمرہ کے معمول میں شامل تھا۔ ان کی تحریروں میں غالبؔ، میرؔ، مومنؔ، فیضؔ، جگرؔ کے اشعار چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مولانا کے اظہار و بیان کی جمالیات میں دراصل بہت کچھ حصہ عالمی ادبیات سے آشنائی کا بھی ہے۔ وہ اس نثری اسلوب کے موید ہیں جو اسلوب ہندوستان میں جنم لینے پہلے یونانی مفکر علامہ شبلی نعمانی کا تھا۔ ان کے الفاظ میں شوکت و جلال اور رعنائی و جمال کا بہت ہی خوبصورت وصال نظر آتا ہے۔ ان کی تحریر صرف جادو نہیں جگاتی بلکہ ذہنوں کے بند دریچوں کو بھی وا کرتی ہے۔ ان کی تحریر میں فکشن کے سارے تشکیلی وترکیبی عناصر موجود ہیں۔ اگر میں انہیں اردو کا ایک بڑا ''فکشن رائٹر'' کہوں تو شاید غلط نہ ہو۔ ان کے باطن میں ایک بہت بڑا افسانہ نگار چھپا بیٹھا تھا اور وہ اپنی ہر تحریر میں بڑی خوبصورت منظرنگاری کرتے تھے۔ ماضی کے واقعات کی بعینہٖ ایسی تصویر کھینچتے تھے جیسے وہ خود اس واقعے کے چشم دید گواہ رہے ہوں۔ اپنی ایک تحریر میں میدان عرفات کا نقشہ کھینچتے ہوئے انہوں نے جو منظرنگاری کی ہے، اس سے ان کی قوت متخیلہ اور قادرالکلامی کا تو اندازہ ہوتا ہی ہے۔ ساتھ ہی قرأت کے عمل سے گزرتے ہوئے قاری اس عصر سے

اس خیرالقرون میں پہنچ جاتا ہے جس میں اس واقعہ کا ظہور ہوا تھا۔ ان کے اظہار و بیان کی جمالیات کا ایک نمونہ دیکھئے:

"اسی طرح سے میدانِ عرفات کا تصور کیجئے۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار کفن بردوش انسانوں کا مجمع ہے۔ لبیک کی صداؤں اور حجاج کی دعاؤں سے فضا گونج رہی ہے۔ خدا کی شان بے نیازی اور عظمت و جبروت کا نقشہ سامنے ہے۔ انسانوں کے اس جنگل میں ایک برہنہ سر، احرام پوش ایسا بھی (فداہ ابی وامی) ہے جس کے کاندھوں پر ساری انسانیت کا بار ہے۔ جو ہر دیکھنے والے سے زیادہ خدا کی عظمت وجلال کا مشاہدہ کررہا ہے اور ہر جاننے والے سے زیادہ انسانوں کی درماندگی، بے حقیقتی اور بے بسی سے واقف ہے۔ اس پر تاثیر اور پر ہیبت فضا میں اس کی آواز بلند ہوتی ہے اور سننے والے سنتے ہیں:

اے اللہ! تو میری سنتا ہے اور میری جگہ کو دیکھتا ہے اور میرے پوشیدہ اور ظاہر کو جانتا ہے۔ تجھ سے میری کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ میں مصیبت زدہ ہوں۔ محتاج ہوں، فریادی ہوں، پناہ جو ہوں، پریشان ہوں، ہراساں ہوں، اپنے گناہوں کا اعتراف کرنے والا ہوں، تیرے آگے سوال کرتا ہوں جیسے بیکس سوال کرتے ہیں۔ تیرے آگے گڑگڑاتا ہوں جیسے گنہگار ذلیل و خوار گڑگڑاتا ہے اور تجھ سے طلب کرتا ہوں، جیسے خوفزدہ آفت رسیدہ طلب کرتا ہے اور جیسے وہ شخص طلب کرتا ہے جس کی گردن تیرے سامنے جھکی ہو اور اس کے آنسو بہہ رہے ہوں اور تن بدن سے وہ تیرے آگے فروتنی کیے ہو اور وہ اپنی ناک تیرے سامنے رگڑ رہا ہو۔ اے اللہ! تو مجھے اپنے سے دعا مانگنے میں ناکام نہ رکھ اور میرے حق میں بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہوجا۔ اے سب مانگے جانے والوں سے بہتر، اے سب دینے والوں سے اچھے۔

کیا خدا کی کبریائی اور عظمت اور اپنی ناتوانی اور بے نوائی، فقر و احتیاج، عجز و مسکنت کے اظہار و اقرار کے لیے اور رحمتِ خداوندی کو جوش میں لانے کے لیے ان سے زیادہ پراثر، پرخلوص اور دل نشین الفاظ انسان کے کلام میں مل سکتے ہیں؟ اور اپنے دل کی کیفیت اور عجز و مسکنت کا نقشہ اس سے بہتر کھینچا جاسکتا ہے؟ یہ الفاظ تو دریائے رحمت میں تلاطم پیدا کرنے کے لیے کافی ہیں۔ آج بھی ان کو ادا کرتے ہوئے دل

امڈ آتا ہے، آنکھیں اشک بار ہوجاتی ہیں اور رحمت خداوندی صاف متوجہ معلوم ہوتی ہے۔ رحمۃ اللعالمینؐ پر اللہ کی ہزاروں رحمتیں ہوں کہ ایسی پرکیف اور اثر آفریں دعا امت کو سکھا گئے اور باب رحمت پر اس طرح دستک دینا بتا گئے۔''

یہ کس قدر سلسبیلی نثر ہے۔ زلال سے زیادہ شیریں اور مٹھاس اس قدر کہ طبرزد اور کعب الغزال بھی رشک کرنے لگیں۔ محولہ بالا عبارت میں اتنی مقناطیسی کشش ہے کہ انسان کے پورے ذہنی وجود کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اور سچ کہوں تو مولانا کی ہر تحریر ہی ایسی ہوتی ہے۔ رات کے اندھیروں میں سورج کی طرح چمکتی ہے اور دن کے اجالوں میں شجر سایہ دار بن جاتی ہے۔ مجھے ایسی آگ اور ایسی روشنی بہت کم مذہبی تحریروں میں نظر آتی ہے۔ ان کی تحریر ہر مومن کے قلب میں قندیل روشن کرتی ہے۔ گوکہ ان کے اسلوب تحریر کے بارے میں اردو کے ایک بڑے نقاد ظ۔ انصاری مرحوم کا کہنا ہے کہ مولانا کے یہاں wording زیادہ ہے۔ بے جا طوالت ہے اور یہ بات صحیح بھی ہے مگر خاکسار کا خیال ہے کہ ''ایضاح المطالب'' کے لیے ہی انہوں نے ایسے اسلوب کو اختیار کیا ہوگا۔ ان کا جو اصلاحی مشن ہے اس کے لیے یہی اسلوب شاید موزوں ہے۔ اس لیے مولانا کی تحریر میں اگر گہر کے بجائے خزف ریزے بھی نظر آئیں تو ہم جیسوں کے لیے وہ شذرات الذہب ہیں۔ ان کی تحریر میں جو دل کشی اور رعنائی ہوتی ہے، اس پر بھی فدا ہیں۔ عام مستوری مولویوں کی طرح ان کی زبان ماراپرتی یا ٹکا کوئی نہیں ہوتی بلکہ ان کے یہاں سلاست، فصاحت اور بلاغت ہوتی ہے اور اس میں علوم و معارف کا دریا بھی موجزن ہوتا ہے۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی کا یہ بھی امتیاز ہے کہ انہوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی اس علمی روایت کی توسیع کی جس کے بنیادگزاروں میں مولانا محمد علی مونگیری اور علامہ شبلی نعمانی جیسے جید علماء تھے۔ انہوں نے ندوۃ العلماء کو عالمی وقار عطا کیا۔ اس حقیقت کے باوصف کہ ندوہ نے کوئی بڑا محدث، فقیہ یا اسماء الرجال کا کوئی بڑا عالم پیدا نہیں کیا اور نہ ہی ایک دینی ادارے کے تاسیسی مقصد کی تکمیل کی۔ پھر بھی ندوہ کا امتیاز اپنی جگہ برقرار ہے کہ عصر حاضر کے تناظر میں اسلام کی جدید تعبیرات و تشریحات جس طرح ندوۃ العلماء کے فضلاء نے کیں اور مستشرقین اور اسلام دشمنوں کے علمی اعتراضات کے جوابات دیے وہ یقیناً قابل فخر ہیں۔ ندوہ کا المیہ کہیے یا اس کا مزاج کہ اس کا ارتکاز لسان پر رہا ہے مگر فقہ اللسان سے اہل ندوہ اب بھی بے بہرہ ہیں۔ اس لیے لسانی ہوش مندی کے مظاہرے کے چکر میں کبھی کبھی ''زبان کا مثلہ'' بھی کر ڈالتے ہیں اور ان کی زبان ''مُعَطّر یت''

ہو جاتی ہے۔ پھر بھی نفس زبان کی حد تک ندوہ کا کردار نا قابلِ فراموش ہے۔ اکبرالہ آبادی مرحوم نے ندوہ کو زبان ہوش مند، علی گڑھ کو معزز پیٹ اور دیو بند کو دل دردمند کہا تھا اور بے وجہ نہیں کہا تھا۔ اس میں جو استعاراتی رمز ہے وہ وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو ان تینوں قومی و ملی اداروں کے داخلی و خارجی کوائف سے مکمل طور پر آشنا ہے۔

مولانا ابوالحسن ندوی کی شخصیت ہمہ جہت تھی۔ انہوں نے صرف ہندوستانی مسلمانوں کی قیادت نہیں کی بلکہ عرب کے بھٹکے ہوئے آہوؤں کو بھی سوئے حرم لانے کی کوشش کی۔ ان کی تحریریں اور ان کی تصانیف عالم اسلام میں بہت مقبول ہیں اور لوگ ان سے استفادہ اور استنجاد کرتے ہیں۔ یہ تحریریں عربوں کے لیے ایک سمت نما کی طرح ہیں۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے مسلمانوں میں ملی شعور پیدا کیا اور ان کے اندر خودداری اور خودشناسی کے احساس کو جنم دیا۔ بالخصوص آج کے ان اصحاب صفہ کو ان کی عظمت کا اور رفعت کا آموختہ یاد کرایا جو خود کو قعر مذلت میں محسوس کرتے ہیں۔ مولانا نے مدارس عربیہ کے طلبا کو احساس کمتری کے غار سے باہر نکالا اور ان کی نفسیاتی کمزوری کا مداوا یوں تلاش کیا:

> ''آپ کے پاس جو دولت ہے، اس سے دنیا کا دامن خالی ہے، آپ کے سینہ میں علوم نبوت ہیں اور وہ حقائق ہیں جو دنیا سے گم ہو چکے ہیں اور جن کے گم ہونے سے آج عالم میں اندھیرا ہے، اضطراب و انتشار، شر و فساد ہے، آپ اپنے ان سادہ کپڑوں، ان حقیر جسموں اور اس خالی جیب و دامن پر نظر نہ کریں، آپ دیکھیں کہ آپ کا سینہ کن دولتوں سے معمور اور آپ کے اندر کیسا بدر کامل مستور ہے:
>
> برخود نظر کشا ز تہی دامنی مرنج
>
> درسینۂ تو ماہ تمامے نہادہ اند

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، علامہ اقبال کی زبان میں ''ملا'' نہیں ''مجاہد'' تھے۔ اپنے اسلامی تشخص کے تحفظ کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار۔ ہندوستان میں جانے کیسے کیسے المناک حادثے رونما ہوئے جس نے مسلمانوں کے زخموں پر نمک چھڑکا اور ملی جذبات کو برانگیختہ کیا مگر مولانا نے ایسے موقعے پر بہت ہی حق بیانی کا ثبوت دیا اور شیر خدا کی طرح انہوں نے مجاہد کی اذان یوں بلند کی:

> ''ہم صاف اعلان کرتے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ آپ بھی اعلان کریں کہ ہم ایسے

جانوروں کی زندگی گزارنے پر ہرگز راضی نہیں جن کو صرف راتب (Ration) اور تحفظ (Security) چاہیے۔ ہم ہزار بار ایسی زندگی گزارنے اور ایسی حقیقت قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ ہم اس سرزمین پر اپنی اذانوں پر نمازوں کے ساتھ رہیں گے بلکہ ہم تراویح اور اشراق وتہجد ادا کرنے کی آزادی کو بھی چھوڑنے کے لیے راضی نہیں۔ ہم ایک ایک سنت کو سینے سے لگا کر رہیں گے اور رسولِ اکرم ﷺ کی سیرت کو سامنے رکھ کر کسی ایک نقش بلکہ کسی نقطہ سے بھی دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں۔''

مولانا کی شخصیت مجمع الکمال تھی۔ ان کی شخصیت کو حافظ شیرازی کے ایک شعر میں یوں سمیٹا جاسکتا ہے:

علم از تو باکرامت و عقل از تو بافروغ
شرع از تو در حمایت و دیں از تو دراماں

مولانا کی شخصیت ایک منارۂ نور تھی جس نے نہ جانے کتنے تاریک جنگلوں کو سبزہ نورستہ میں بدل دیا۔ کتنے تاریک ایوانوں کو بقعہ نور بنادیا۔ مولانا کی شخصیت میں ایک جادو تھا اور وہ جادو ہر صدی میں سرچڑھ کر بولے گا۔ کوئی بھی صدی مولانا کے سحر سے آزاد ہوکر جی نہیں سکتی...

✪✪✪

مرے فلک پہ کوئی آفتاب ہے کہ نہیں

قاضی مجاهد الاسلام قاسمی کی یاد میں

قاضی مجاہدالاسلام قاسمی کی آفتابی حرکی شخصیت نے ملت کو صحیح سمت دکھائی، ایسی سمت جس میں ملت کی فلاح و خیر بھی مضمر تھی، امن و امان اور تحفظ بھی۔ قاضی صاحب کے وجود سے ملت کا تحرک قائم تھا، ملت کی موجوں میں طغیانی تھی۔ وہ ایک ایسی بلند نگاہ شخصیت تھے جنہوں نے ملت کو درپیش مسائل اور بحران پر ہمیشہ اُسی انداز میں سوچا جس انداز میں کسی زمانے کا کوئی مجدد یا مجتہد سوچتا ہے۔ وہ بیسویں صدی کے ایک ایسے زعیم و قائد تھے جن کی دروں نگاہوں نے وہ سارے مسائل محسوس کر لیے تھے جو ملت کو پیش آنے والے تھے۔ فقہی مباحث اور عائلی مسائل پر جس مجتہدانہ بصیرت اور فقہی فراست کا ثبوت انہوں نے دیا ہے شاید ایسی فراست بہت کم عالموں کو نصیب ہوئی ہے۔ تن تنہا وہ کارنامہ انجام دیا جو ملت کے کئی اجتماعی ادارے بھی مل کر نہ انجام دے سکتے۔

قاضی صاحب نے ملت کی قیادت اُس وقت سنبھالی جب ملت بے سمتی کی طرف گامزن تھی۔ بھٹکے ہوئے آہوؤں کو سوئے حرم لانے کے لیے انہوں نے پیہم کوشش کی اور اپنی کوششوں میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔ اُن کے اندر قیادت کی تمام تر صلاحیتیں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ ایک قائد کے

لیے جس نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے ملت کو بھنور میں دیکھا اور کشتیوں کو ڈوبتے ابھرتے محسوس کیا اور یہ اندازہ کیا کہ ملت کے اندر جو شگاف پیدا ہوگیا ہے، اُس کی وجہ سے ملت کی کشتی ڈوب سکتی ہے تو انہوں نے آل انڈیا ملی کونسل کی بنیاد ڈالی۔ اس کا لائحۂ عمل تیار کیا۔ اس کے تاسیسی مقاصد سے پورے ہندوستانی علماء اور دانشوروں کو آگاہ کیا اور تمام حلقۂ فکر کے علماء اور زعماء سے مل کر وحدتِ ملت کی بات کی اور سب کو ایک پلیٹ فارم پہ مجتمع کر دیا۔ یہ دراصل اُن کی شخصیت کا سحر ہی تھا کہ تمام لوگ مسلکی امتیازات اور فروعی اختلافات سے ماوراء ہوکر آل انڈیا ملی کونسل سے منسلک ہوگئے اور ملت کے اُس پیغام کو عام کرنے لگے جس پیغام میں وحدت اور انسانیت کا درس تھا۔

قاضی صاحب کے اندر اتنی فکری اور ذہنی کشادگی تھی کہ کسی بھی فرقے یا مسلک سے وابستہ لوگوں کو اُس میں گھٹن نہیں محسوس ہوتی تھی۔ اُن کی عزت ان کے مخالفین ومعاندین بھی کرتے تھے اور ان کی فقہی بصیرت اور مجتہدانہ لیاقت کے معترف بھی تھے۔ قاضی صاحب کی وسعتِ نظری اور کشادہ روی نے ہی ملی کونسل کے دائرۂ کار کو وسیع کیا اور جب مولانا ابوالحسن ندوی کی وفات کے بعد ملت کی قیادت کا گمبھیر مسئلہ سامنے آیا تو بیک وقت سب کی نظر ایک ہی شخصیت پر پڑی اور وہ شخصیت قاضی مجاہد الاسلام کی تھی۔ کسی نے اُن کی قیادت پر نہ کوئی سوالیہ نشان قائم کیا اور نہ کسی نے اعتراض کیا بلکہ باتفاق رائے سبھی نے اُنہیں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا صدر منتخب کرلیا۔ یہ اُن کی کشادہ نظری کی کرامت تھی۔

قاضی مجاہد الاسلام اس دور کے مجتہد تھے۔ انہوں نے عصرِ حاضر میں پیش آنے والے بہت سے پیچیدہ مسائل پر سنجیدگی سے غور وفکر کیا اور ایسے نتائج اخذ کئے جو عصرِ حاضر سے ہم آہنگ بھی ہوں اور قرآن وحدیث سے ہم رنگ بھی۔ عائلی مسائل پر ان کی نظر بہت گہری تھی۔ طلاق اور فسخ نکاح کے پیش آنے والے روزمرہ کے مسائل کا حل، جس خوش اسلوبی سے وہ پیش کرتے تھے اُس میں اُن کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ روزانہ بدلتے ہوئے فکری منظرنامے اور نت نئے مسائل کے کینوس پر اُن کی بہت باریک نظر تھی اور وہ اُن مسائل پر تدبر اور تفکر فرماتے تھے اور قرآن وحدیث کی روشنی میں مسائل کا استنباط اور تخریج کرتے تھے۔ کتنے ہی پیچیدہ مسائل کیوں نہ ہوں اُس کا خوبصورت حل تلاش کر لینا، ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ یہ اُن کی ژرف نگاہی، علمی وسعت اور فقہی بصیرت کی دلیل تھی۔ ملت اسلامیہ کی تاریخ میں فقہا کی ایک بڑی لمبی فہرست ہے۔ اُن میں ایسے ایسے ذہین فقہا تھے جو قرآن وحدیث کی روشنی میں مسائل کا استخراج کرتے تھے مگر وہ آج کے زمانے میں

ہوتے تو شاید ایسے فقہا کی جبینوں پر بھی شکنیں ابھر آتیں اور وہ نت نئے مسائل سے پریشان ہو اٹھتے مگر قاضی صاحب کا کمال تھا کہ وہ گنجلک، مبہم، مغلق اور پیچیدہ مسائل پر بھی بہت ہی آسانی کے ساتھ نئے تناظر میں اُس کا حل ڈھونڈھ لیتے تھے۔ انہوں نے فقہ کو ایک نیا تناظر عطا کیا ہے اور جمود اور تحجر کو توڑا ہے۔

قاضی صاحب ایک انتہائی فعال اور متحرک شخصیت تھے۔ انہوں نے پوری زندگی ملت کے لیے وقف کردی تھی۔ ملت کی فلاح و بہبودی ہی اُن کے پیشِ نگاہ تھی۔ اُن کے سینے میں سارے جہاں کا درد تھا۔ وہ بہت ہی دردمندی کے ساتھ ملت کے بارے میں سوچتے تھے اور اسلامی بصیرت کی روشنی قریہ قریہ نگر نگر پھیلانا چاہتے تھے۔ چنانچہ جب وہ بہار اڑیسہ کی امارت شرعیہ سے وابستہ ہوئے تو دور دراز، پس ماندہ علاقوں میں رفاہی اور ملی ادارے قائم کئے، مکاتیب قائم کئے، ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ قائم کئے، ہاسپٹل قائم کئے اور جب بھی مسلمانوں پر کوئی قیامت گزرتی تھی تو قاضی صاحب بلک اٹھتے تھے۔ اُن کے سینۂ سوزاں سے اُس وقت ملت کے لیے بس ایک آہ اٹھتی تھی اور وہ آہ پورے ہندوستان میں گریہ زاری کی شکل اختیار کر لیتی تھی۔

قاضی صاحب بہت بڑے فقیہ تھے۔ اُن کی فقہی بصیرت کا اعتراف صرف ہندوستانی علماء اور فقہا ہی نہیں بلکہ عالم عرب کے ممتاز فقہا بھی کرتے ہیں۔ جدید معاشرتی، ساجی، تجارتی مسائل پر اُن کی بہت اچھی نظر تھی۔ انہوں نے ایک اسلامی فقہ اکیڈمی قائم کی جس کی تاسیس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے لیے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ایک اسلامی فقہی قانون مرتب کیا جائے۔ اس مقصد میں انہیں کامیابی ہوئی۔ انہوں نے فتاوے اور قضایا کی جتنی اہم کتابیں تھیں اُنہیں ایڈٹ کیا اور ملت کے سامنے وہ سارا سرمایہ رکھ دیا جس سے وہ اپنے پیچیدہ مسائل کا حل ڈھونڈھ سکیں۔ چار جلدوں میں 'صنوان القضا' کی ترتیب و تدوین مجموعہ قوانین اسلامی اور مجلہ بحث ونظر کے شمارے، ان کی فقہی اور اجتہادی بصیرت کے روشن ثبوت ہیں۔ اس کے علاوہ قضایا سجاد، حکومت الٰہی، مکاتیب سجاد اور قانونی مسودے کی ترتیب و تدوین ایسے کارنامے ہیں جو کبھی بھلائے نہیں جاسکتے۔ انہوں نے مولانا ابوالمحاسن سجاد کے آثار و باقیات کو جس اہتمام کے ساتھ پیش کیا، وہ ان کی علمی لگن، محنت اور اسلاف شناسی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

قاضی مجاہدالاسلام قاسمی بلند پایہ خطیب بھی تھے۔ اُن کے اندر سوز و سازِ رومی بھی تھا اور پیچ و تاب رازی بھی۔ وہ جب تقریر فرماتے تھے تو مجمع پر سکوت طاری ہو جاتا تھا۔ ایک سناٹے کا عالم ہوتا تھا۔ ہر شخص کی نگاہیں اُن کے چہرے پر اور ان کی گل افشانی گفتار پر ہوتی تھیں۔ قاضی صاحب جب

بولتے تھے تو اُن کی زبان سے پھول جھڑتے تھے اور ایسا لگتا تھا جیسے ہونٹوں سے اوس کی بوندیں گر رہی ہوں۔ قاضی صاحب کی شیریں گفتاری کے قائل وہ لوگ بھی تھے جو اُن کے مخالفین میں شمار ہوتے ہیں۔

قاضی صاحب ملت اسلامیہ کی چودہ سو سالہ تاریخ کو نئے عصری تناظر میں دیکھتے تھے اور آج کے عہد میں اُس کی معنویت کو آشکار کرتے تھے اور اپنی فصاحت لسانی اور بلاغت بیانی سے ایک طلسماتی کیفیت پیدا کر دیتے تھے۔ 'خطبات بنگلور' اُن کی ایک ایسی کتاب ہے جس میں اُن کے پانچ خطبے شامل ہیں۔ اِن خطبوں کو پڑھ لیجیے اندازہ ہو جائے گا کہ علم کا دریا موجیں مار رہا ہے اور ادراک وعرفان کی لہریں رواں ہیں۔ اپنی ایک تقریر میں اُس واقعے کے حوالے سے جس میں حضور کو مجنوں اور پاگل کہا گیا تھا، آج کے تناظر میں اس کی عصری معنویت کو یوں آشکار کرتے ہیں:

اے لوگو! یہ تھا ''ابولہبی میڈیا'' اور آج اسی میڈیا کی ترقی یافتہ صورت ہے جو امریکہ، انگلینڈ اور ہندوستان میں نظر آتی ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن دنیا نے دیکھا کہ ابولہب کا وہ میڈیا ناکام ہوا۔ نبی ﷺ کی لائی ہوئی سچائیوں اور حقیقتوں کے سامنے یہ میڈیا کارگر نہ ہوسکا۔ سچائی اپنا وجود رکھتی ہے۔ حقائق اپنا وجود رکھتے ہیں جن کے پاس حقیقت ہوگی ان کو میڈیا سے گھبرانا نہیں چاہیے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

ابولہب کی یہ نعرہ بازیاں، جھوٹی نشر و اشاعت اور جھوٹی پبلیسٹی، جناب محمد ﷺ کی خاموش مگر حقیقت پر مبنی دعوت کے مقابلہ میں ٹھہر نہ سکی۔ انتہائی درجہ معتدل، ردِ عمل سے بچتے ہوئے، چوٹ سہتے اور حکمت عملی کے ساتھ قدم آگے بڑھاتے ہوئے، کبھی چچا سے جھگڑے نہیں، کبھی ابولہب کی بات کا جواب تک نہیں دیا۔ اپنا کام کرتے رہے، سچائیاں غالب ہو کر رہتی ہیں۔

قل جاء الحق وزهق الباطل ان الباطل كان زهوقا۔ الاسراء:۸۱)

''حق آ گیا، باطل مٹ گیا اور بے شک باطل مٹنے کے لیے تو آیا ہی ہے۔''

''لوگو! کیا آنحضور ﷺ کا یہ عمل ہمارے اور تمہارے لیے سوچنے کے لیے نہیں ہے۔ آج علم و دانش کے نام پر، پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کے نام پر، بڑے بڑے

دماغوں کی پلاننگ کی بنیاد پر، اسلام اور رسول کی تصویر کو بگاڑنے کی جو بھی سازش کرتے رہیں، ناکامی ہی ان کا مقدر ہے۔ سچائیاں اور حقائق غالب ہو کر رہتے ہیں۔ ہمیں ہمت ہارنے اور مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ابولہب کا چراغ بجھ سکتا ہے اور مصطفی ﷺ کا چراغ چمک سکتا ہے اور ''سراج منیر'' بن کر پوری کائنات کو ضوفشاں کرسکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ آج بھی وہی چراغ مصطفوی روشن نہ رہے اور کائنات کو اپنی کرنوں کا اسیر نہ بنالے۔''

قاضی مجاہدالاسلام نے اپنے ایک خطبے میں اسلام کی عالم گیریت اور قانون کی وحدت پر خطبہ دیتے ہوئے یہ کہا ہے کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کے پاس پوری کائنات کے لیے عالمی قانون ہے اور وہ عالمی قانون سب کے لیے قابل قبول بھی ہے۔ کیونکہ انسانی قانون سب کے لیے الگ ہوسکتا ہے لیکن قانون الٰہی سب کے لیے یکساں ہے۔ کیونکہ "الخلق عیال الله" ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔ قانون کون بنائے ؟ اس حوالے سے انہوں نے خطاب فرماتے ہوئے کہا:

''لوگو! دنیا کو ایک ایسے موحد اور یکساں قانون کی ضرورت ہے کہ ساری انسانیت کے لیے تنہا ایک قانون اور یکساں قانون ہو، جو پوری کائنات کو ایک نظر سے دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو، اگر ہندوستان کی پارلیمنٹ کوئی قانون بناتی ہے تو امریکن کے مفادات کی شاید حفاظت نہ ہوسکے، امریکن کانگریس اگر کوئی قانون بناتی ہے تو ضروری نہیں کہ وہ ہندوستانی مفادات کی حفاظت کرے، اگر انگلینڈ میں ایک قانون بنتا ہے تو ضروری نہیں کہ ملکہ برطانیہ سعودی عرب کی بھلائی اور وہاں کے شہریوں کی بھلائی کو دیکھ سکے، اس لیے ہم تو ہر ایک کو شک کی نگاہ سے دیکھیں گے، ہندوستانی، امریکن قانون کو، امریکن، برٹش کے قانون کو، برٹش شہری، سعودی کے قانون کو سعودی، عراقیوں کے قانون کو اور عراقی کویت کے پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قانون کو، انسانوں کی اپنی ایسی بنائی ہوئی قانون ساز اسمبلیز اور لجسلیٹو جب بھی کوئی قانون بنائیں گے تو اُن کے بارے میں یہ امکان رہے گا کہ وہ دوسرے کے حقوق کی حفاظت نہ کرپائیں گے، اس لیے ایک ایسے قانون ساز کے پاس چلو جس کے پاس آدمی آدمی کا، ملک ملک کا، نسل نسل کا کوئی فرق نہیں ہے اور وہ صرف اللہ ہی ہوسکتا ہے جو خالق و مالک ہے۔ اسی نے اپنے ہاتھوں سے امریکن کو بنایا، اسی نے عربوں کو

بنایا، اسی نے عجم کے لوگوں کو بنایا، اسی نے ہندوستان کے لوگوں کو بنایا، اس کی نظر میں آدمی اور آدمی کے بیچ کوئی فرق نہیں ہے۔

اس لیے اسلام کی عالمگیریت اور قانون کی وحدت ساری انسانی کائنات کے لیے اس لیے قابلِ قبول ہے کہ اس کائنات کا پیدا کرنے والے کی نگاہوں میں ساری مخلوق برابر ہے۔''

قاضی صاحب جہاں دیدہ تھے۔ عالمی تہذیبی روایات اور بدلتے ثقافتی منظرنامے سے وہ آشنا تھے۔ اُن کے ذہن میں نہ کوئی دھند تھی اور نہ تشویش و تشکیک۔ وہ ہر ایک تہذیبی روایت پر ویسی ہی نظر ڈالتے تھے جو ایک بلند نظر کا تقاضہ ہوتی ہے۔ اسلامی اور مغربی تہذیب کے فاصلوں سے وہ بخوبی واقف تھے۔ پھر بھی وہ ایک جگہ خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''ایسا نہیں ہے کہ مغرب میں کوئی خوبی ہی نہیں ہے، اس کی بعض اخلاقی خوبیوں اور انسانی قدروں کا معترف ہوں۔ معذوروں کی خدمت کا جذبہ اور یہ بات کہ ان کے یہاں کوئی شخص بے کار نہیں رہ سکتا۔ کوئی بھوکوں نہیں مرسکتا۔ سوشل سیکوریٹی ان کو ضرور کھلائے گی، میں نے ان میں بہت سی خوبیاں آنکھوں سے دیکھی ہیں، مجھے لگتا ہے کہ ان کے یہاں یہ محمد رسول اللہ ﷺ کی برکتوں کا چھینٹا پہنچا ہے اور افسوس کہ یہ برکت ہمارے سماج سے اٹھتی جارہی ہے، ہمارا حال یہ ہے کہ پڑوسی بھوکا ہے، ہم عمدہ سے عمدہ غذا کھاتے ہیں، ہمارے بھائی کو کپڑا میسر نہیں، ہم اچھے سے اچھے کپڑے پہنتے ہیں۔ اپنے گھر میں اچھا سے اچھا فرنیچر رکھتے ہیں اور ہزاروں روپے کے قیمتی قالین اور پردے بچھاتے اور لگاتے ہیں اور ہمارے پڑوس میں ایسے غریب و نادار بھائی بھی ہوتے ہیں جن کو سر چھپانے کے لیے ایک سائبان بھی میسر نہیں اور بیسیوں افراد ہیں جو ٹھنڈک میں ٹھٹھر کر اپنی جان دے دیتے ہیں، کیا یہی اسلام کی تعلیمات ہیں؟ اور یہی پیغمبر اسلام کے دیے ہوئے اخلاق ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ مغرب کو اگر جوہر ایمان حاصل ہوجائے تو وہ انسانیت کا صحیح نمونہ بن جائے۔ لیکن افسوس کہ مادیت کے جنون نے ان کو بدمست کر رکھا ہے، ان کے یہاں انسانیت صرف پیٹ کا نام ہے۔''

'خطبات بنگلور' کی ایک ایک سطر میں علوم و معارف کا خزانہ اور حسن نظر کا نور چمک رہا ہے۔ اس کتاب نے سید سلیمان ندوی کے 'خطبات مدراس' کی یاد تازہ کردی ہے۔

قاضی صاحب اسلاف کے سچے امین اور جانشین تھے۔ انہوں نے کبھی اپنے بزرگوں کو فراموش نہیں کیا۔ اسی لیے انشاء اللہ نئی نسل بھی اُن کو فراموش نہیں کرے گی۔ کیونکہ ان کی خدمات جلیلہ ناقابل فراموش ہیں اور ان کے کارنامے انتہائی عظیم ہیں۔

قاضی صاحب ملت کا ایک انتہائی بیدار اور متحرک ذہن تھے جنہوں نے پوری ملت کو بحران کے منجدھار اور مسائل کے گرداب سے باہر نکالا اور بیمار ہوتی ہوئی ملت میں زندگی کی روح پھونکی اور اپنی تصنیفات سے انہیں نسخۂ شفا عطا کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ قاضی صاحب ہمارے دور میں ملت کے آخری مجتہد اور مسیحا تھے۔ اب ان کے بعد ہر طرف گھپ اندھیرا ہے۔ گھٹا ٹوک تاریکی ہے۔ ایسی تاریکی کہ چاند سورج بھی اسے دور نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ان کی شخصیت چاند اور سورج کی ساری ضیا بار کرنوں کو اپنے وجود میں سمیٹ کر مٹی میں روپوش ہوگئی ہے اور جب کوئی عالم روئے زمین سے اٹھتا ہے تو خدا علم سلب کر لیتا ہے:

وہ تیرگی ہے کہ اکثر خیال آتا ہے
مرے فلک پہ کوئی آفتاب ہے کہ نہیں
— معین احسن جذبی

✪✪✪

کبیر الدین فوزان کے فکری تفردات

کبیر الدین فوزان، یونان میں ہوتے تو رفعت و عظمت میں فاران کی چوٹی پر ہوتے، شیراز و اصفہان میں ہوتے تو شہرت کے کوہ دماوند پر ہوتے۔ سیلان، حرث وحویرث پہاڑوں جیسی بلندیاں ان کا نصیب ہوتیں مگر وہ ستم نصیب ہیں کہ انہوں نے ایک ایسے منطقے میں جنم لیا جہاں کی مٹی شہرت تو کیا، محبوبیت، مقبولیت بھی چھین لیتی ہے۔ جہاں آفتاب کو بھی ذروں میں تبدیل ہوتے دیر نہیں لگتی، جہاں گنج ہائے گراں مایہ کو گرد و غبار میں گم ہوتے وقت نہیں لگتا۔

وقت نے کیسے کیسوں کو عرش الکمال پر پہنچا دیا، کتنے بے تہوں کو عقد ثریا بنا دیا مگر کبیر الدین فوزان جیسا فطین، ذہین، جینیس فن کار آج بھی اپنی ہی مٹی، اپنے ہی منطقے میں محدود ہے۔ جس فوزان کو 'اول الاسماء' کی حیثیت حاصل ہونی چاہیے تھی، اب بھی وہ پچھلی قطار میں ہے جب کہ ان کے قد و قامت سے کہتر قلم کاروں کا شمار دانشوروں کی صف اول میں ہوتا ہے۔

یہ المیہ انڈیا کا ہے، یورپ کا نہیں۔ فوزان یورپ میں ہوتے تو ان کی علمی تحقیقات اور ترقیات کی اس طرح قدر افزائی ہوتی کہ ان کے نام پر انسٹی ٹیوٹ کا قیام عمل میں آتا، ان کے افکار و نظریات کے حوالے سے نئے تنقیدی ڈسکورس کا آغاز ہوتا، مگر حیف صد حیف فوزان اپنی تمام تر وسعت علمی اور بلند نظری کے باوجود گوشہ گمنامی میں ہیں۔

کبیر الدین فوزان کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ صورتاً، سیرتاً درویش اور فقیر ہیں مگر علماً اور عقلاً

لکیر کے فقیر نہیں۔ ذہنی محکومی اور تقلیدی روش ان کا شیوہ نہیں، بلکہ اکتشافی، اجتہادی طریق کار اور مسلسل تفکر و تدبر ان کی روش ہے۔ وہ ستاروں کا جگر چاک کرنے اور نئے حقائق و اسرار کی جستجو کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ان کے تفحص آمیز اور تفرد آشنا ذہن نے انہیں اجتماعی محور اور مطاف سے انحراف کے لیے مجبور کیا ہے اور یہی انحرافی رویہ قبض قلوب، ضیق صدور کے شکار اور ظلمت ثلث میں اب تک اسیر لوگوں کو اچھا نہیں لگا۔ انہوں نے مذہب کو مزبلہ (کباڑ خانہ) بنانا گوارا تو کیا مگر مذہب کے نام پر جمع شدہ کوڑا کباڑ کو جلا کر خاکستر کر دینے والے فرد کو برداشت نہیں کیا اور لطف کی بات یہ ہے کہ ہر مسئلہ پر ایک دوسرے سے لڑنے والے مولوی، ان کی مخالفت پر موافق ہو گئے۔

کبیر الدین فوزان، مُمعی مولوی (بے رائے مولوی) نہیں ہیں بلکہ اہل نظر اور صاحب رائے ہیں۔ گو کہ انہوں نے تعلیم دیوبند کی روایتی فضا میں حاصل کی مگر روشن خیالی اور تجدد پسندی میں وہ علی گڑھ سے بھی کئی قدم آگے ہیں۔ سرسید کی سائنٹفک سوچ، معروضی منطقی منہج فکر کا اطلاق اپنے افکار پر کیا اور مذہبی، ملی مسائل میں پیراڈائم شفٹ کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ایک نئے تناظراتی نظام کی تشکیل پر زور دیا۔ لبرل، ماڈرنسٹ اپروچ ہی نے فوزان کو طبقہ علماء میں شاذ بنا دیا۔

فوزان کی ذہنی، نظری فعلیت بھی مختلف ہے اور نظام فکر بھی جداگانہ ہے۔ ان کے فکری تفردات کی فہرست کافی طویل ہے۔ جمہور علماء اور سوادِ اعظم سے الگ انہوں نے خوف و خطر سے پر راہ چنی ہے لیکن اس انتخاب میں بھی نہایت نیک جذبہ پنہاں ہے۔ انہوں نے اہل اسلام کے ایقاظ کے لیے یہ راستہ چنا اور اسلام کو ایک مکمل ضابطہ حیات کے طور پر پیش کیا۔ وہ عصری تغیرات اور تبدیلیوں سے اسلام کو ہم آہنگ کرنا چاہتے ہیں تا کہ آج کی دنیا میں اسلام، افکار و نظریات اور مذاہب کی بھیڑ میں ''اجنبی'' بن کر نہ رہ جائے۔ چنانچہ قمری کیلنڈر کی غیر معتبریت کے بارے میں ان کی رائے بھی اسی احساس کا مظہر ہے۔ آج کے تناظر میں ان کی رائے تو اور زیادہ معتبر اور متوازن نظر آتی ہے کہ ایک ہی ملک، ایک ہی ریاست، ایک ہی ضلع میں عید جیسا اجتماعی تہوار دو روز الگ الگ منایا جاتا ہے۔ اس میں سارا قصور قمری کیلنڈر کا ہے، اسی لیے فوزان قمری مہینے کے تعین کو روایت بصری سے مشروط نہیں مانتے بلکہ فلکی حساب کو زیادہ مستند گردانتے ہیں۔ ان کا یہ خیال ہے کہ جدید آلات رصدیہ کی موجودگی میں فلکی حساب کو نہ ماننا سراسر جہالت کا ثبوت دینا ہے۔ رویت کی شہادت ظنی ہو سکتی ہے مگر فلکیات کا حساب قطعی ہے۔ دن، رات کے اختلاف اور اوقات نماز کے تعین میں فلکی حساب پر ہی سارا انحصار ہوتا ہے تو پھر اس سے اس قدر نفور بیزاری کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ فوزان صاحب کی یہ منطق بالکل صحیح ہے کہ ''چودہ سو سال پہلے چونکہ قمری مہینے کی ابتدا و انتہاء

معلوم کرنے کے لیے صرف ایک حسی ذریعہ رویت ہلال کے سوا دوسرا کوئی ذریعہ نہیں تھا اور اہل عرب فلکی حساب و کتاب سے ناواقف اورلاعلم تھے۔اس لیے حضور نے صوموالرویۃ کا حکم دیا تھا مگر اب ایک دوسرا ذریعہ فلکی حساب ہماری دسترس میں ہے اور لاعلمیت و ناواقفیت کی علت بھی ختم ہو چکی ہے۔اس لیے جدید ذریعہ سے کام لے کر برسوں پہلے مہینے کا تعین کیا جاسکتا ہے،اس کے ساتھ ہی حضور کا ارشاد گرامی ہے''تم اپنے دینی امور میں میری طرف رجوع کرو اور اپنے دنیاوی امور کو تم خود زیادہ جاننے والے ہو۔ارض و قمر کی حرکت و گردش ہو یا اس کے مدار و مقدار رفتار اور اس کے نتیجے میں شمس و قمر کا طلوع و غروب سب ہمارے دنیاوی امور ہیں جن کے نتیجے میں دن رات،صبح و شام اور ماہ و سال بنتے ہیں اور اس کی صحیح جانکاری ہم کو حاصل ہے۔اسی لیے اب اسی سے کام لیا جائے تاکہ قمری تاریخ میں ہر سال واقع ہونے والا اختلاف ختم ہو جائے۔غرض یہ کہ ایام رمضان، یوم الفطر اور ایام تشریق میں وحدت و یکسانیت لانے کے لیے فلکی حساب پر اعتماد کرنا اور بے شمار مطالع کے اعتبار کرنے کے بجائے پوری دنیا کے لیے صرف دو مطلع قرار دینا ضروری ہے۔''

(کبیر الدین فوزان،قمری کلینڈر اور عبادات ص: ۶۷)

یہاں بھی ایک نیک جذبہ کارفرما ہے اور وہ ہے اسلامی اجتماعیت۔عید الفطر میں رویت بصری کی وجہ سے اجتماعیت،انتشار کی شکار ہو جاتی ہے۔مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اسی وحدت کی طرف اشارہ کیا ہے۔فوزان صاحب نے اپنی کتاب قمری کلینڈر میں تمام تر اشکالات و اشتباہات کا ازالہ کرتے ہوئے اپنے موقف کی مدلل وضاحت کی ہے۔ضرورت ہے کہ ان کی معروضات پر سنجیدگی سے غور کیا جائے اور ملی انتشار سے عوام کو محفوظ رکھا جائے۔

مولانا کبیر الدین فوزان اسلام کو کوئی دین یا مذہب نہیں مانتے اور نہ ہی ادیان سابقہ کو منسوخ اور دین محمدی کو ناسخ تسلیم کرتے ہیں۔ان کی رائے میں قرآن میں مستعمل لفظ اسلام کا مفہوم محض اطاعت اور فرماں برداری ہے۔اس سے مراد کوئی مذہب نہیں ہے۔انہوں نے لغوی،اصطلاحی تمام اعتبارات سے اس تصور کی تنسیخ کر دی ہے کہ اسلام کسی مذہب کا نام ہے۔دین کی تقسیم،تنسیخ کے نظریے کو غیر قرآنی اور تفریق فی الدین قرار دیتے ہوئے انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ''حضرت نوح سے لے کر حضرت محمد تک کا دین خدا کے نزدیک ایک ہی ہے یعنی ناقابل تقسیم وحدت ہے۔ایسی صورت میں دین نوحی،دین ابراہیمی،دین داؤدی،دین موسوی و دین عیسوی کو منسوخ قرار دینے سے غور کیا جائے تو خود دین محمدی کے منسوخ ہونے میں کون سی کسر باقی رہ جاتی ہے اور کیا یہ عقل میں آنے والی بات ہے کہ ایک ہی شے (دین) ناسخ بھی ہو اور منسوخ بھی۔'' (کیا اسلام کسی

مخصوص دین کا نام ہے: ۱۷)

انہوں نے منصوص اور مدلل انداز میں یہ ثابت کردیا ہے کہ انبیاء سابقین کا دین دین محمدی سے مختلف نہیں ہے اور یہ کہ دین محمدی کی تکمیل سے ادیان سابقہ کی تنسیخ ثابت نہیں ہوتی۔

کبیرالدین فوزان نے انتہائی حساس اور نازک مسئلہ پر اظہار خیال کیا ہے اور اسرار شریعت سے ناآشنا دین فروش طبقہ کے زبردست لتے بھی لیے ہیں۔ یہ ان کی ہی جرأت رندانہ ہے کہ بلا خوف و خطر ایسے مسائل پر لکھتے ہیں اور مسکت، دنداں شکن دلائل سے مخالف کو بھی مبہوت کردیتے ہیں۔ انہوں نے جس طریقہ سے اپنا موقف پیش کیا ہے، اس کو نکارنے کی ہمت شاید ہی کوئی کر سکے۔

یتیم پوتے کی وراثت سے متعلق بھی کبیرالدین فوزان نے عام علماء سے مختلف موقف اختیار کیا ہے۔ ان کے خیال میں یتیم پوتے کو وراثت سے محروم کرنا غیر منصوص ہے جب کہ علماء امت محمدیہ قرآن وحدیث اور اجماع کی روشنی میں یتیم پوتے کی عدم توریث کے قائل ہیں۔ فوزان صاحب کا کہنا ہے کہ قرآن نے کہیں بھی صراحتاً یا اشارتاً یتیم پوتے کو محروم الارث قرار نہیں دیا ہے اور نہ ہی حدیث نبوی اس کی تائید میں موجود ہے۔ انہوں نے لفظ اب (باپ) اور ابن (بیٹا) کے معنیاتی توسع کا حوالہ دیتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ لفظ 'اب' دادا اور باپ دونوں کو محیط ہے اور ابن بھی بیٹا اور پوتا کو۔ اکثر احکامات میں بھی دادا باپ کے اور پوتا بیٹے کے قائم مقام ہوتے ہیں۔ دادا جب بمنزلہ باپ اور پوتا بمنزلہ بیٹا ہیں تو پھر یہ تفریق کا جواز کیا ہے۔ دادا کو پوتے کی وراثت مل سکتی ہے تو یتیم پوتا محروم الارث کیوں؟'' انسانی معاشرہ اور سماجی سروکار سے جڑا ہوا یہ ایک اچھا سوال ہے۔ فوزان صاحب نے بالکل صحیح اشارہ کیا ہے کہ'' یہ کس قدر نامعقول اور ناانصافی کی بات ہے کہ کوئی یتیم پوتا باپ کے واسطے سے اپنے دادا کی نسلی خصوصیات، غباوت بدصورتی اور خاندانی بیماری کا وارث تو بن جائے مگر دادا کی مادی یا مالی میراث سے محجوب قرار دیا جائے، محض چچا کی موجودگی کے باعث! اور اس کے برعکس کوئی صاحب جائیداد یتیم پوتا مرجائے تو چچا کی موجودگی کے باوجود دادا کو اس کی جائیداد کا وارث اور حق دار ٹھہرایا جائے؟'' (فوزان، یتیم پوتا: ۴۸)

فوزان صاحب نے منطقی، معاشرتی، بشری اور منصوص طریقے سے اس مسئلہ پر مدلل لکھا ہے اور یتیموں کی دست گیری کرنے والے مذہب کے علماء کو اپنے موقف میں تبدیلی لانے کی بات کہی ہے۔ بعض علماء نے بھی استحسان کے ذریعہ اس مسئلہ کو حل کرنے کا اشارہ دیا ہے۔ یہ مسئلہ بھی اہم ہے۔ اس لیے نہایت سنجیدگی سے اس پر اجتہادی طریق کار سے سوچنا چاہیے۔

نظریہ ارتقاء کے تعلق سے بھی کبیرالدین فوزان کا نقطہ نظر ترقی پسندانہ ہے۔ ان کے خیال میں

قرآن اور نظریہ ارتقاء کے مابین کوئی تخالف یا تباین نہیں ہے بلکہ قرآن کریم سے بھی نظریہ ارتقاء ہی کی تائید وتوثیق ہوتی ہے۔ یہ موقف انہوں نے اپنے مقالہ ''قرآن اور نظریہ ارتقاء'' میں پیش کیا ہے جو ڈاکٹر سید عابد حسین جیسے جید دانشور کی ادارت میں نکلنے والے علمی و تحقیقی مجلّہ اسلام اور عصر جدید، نئی دہلی میں چار قسطوں میں شائع ہوا۔ اس مقالے پر کافی بحث و تمحیص ہوئی، اس سے قبل فوزان صاحب کے ہی ایک مراسلہ کے جواب میں عامر عثمانی مرحوم نے تجلی دیوبند کا ارتقاء نمبر شائع کر دیا تھا۔ نظریہ ارتقاء کو علماء اسلام نے کبھی تسلیم نہیں کیا بلکہ اس کا مذاق ہی اڑایا۔ حتیٰ کہ اکبرالہ آبادی مرحوم نے بھی یوں نشتر زنی کی:

ہم تو انسان سے بنے جاتے ہیں بندر اے حضور
آپ خوش قسمت تھے بندر سے جو انسان ہو گئے
یہ دعویٰ ہے غلط تو ڈارون صاحب خطا بخشیں
خدا انسان کا خالق، خدا بندر کا خالق ہے

لندن کے Abbey علاقہ میں مدفون ڈارون کے نظریہ ارتقاء کے خلاف کافی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ہارون یحیٰی نے بھی The Evolution Deciet میں قرآن کے نظریہ تخلیق کو مستند اور ڈارون کے نظریے کو فریب قرار دیا ہے۔ بہر حال ایک نئی جہت اور ایک نیا زاویہ تلاش کرنے کے لیے کبیر الدین فوزان لائق ستائش ہیں۔ قرآن اور ڈارونی نظریہ ارتقاء کے ارتباط پر انہوں نے جو دلائل پیش کیے ہیں وہ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔

کبیر الدین فوزان، نکات عجیبہ کی تلاش میں ہمہ وقت مستغرق رہتے ہیں۔ انہوں نے ایک نیا نکتہ یہ پیش کیا ہے کہ عورتوں کے ساتھ تعصب اور امتیاز صرف سماجی یا سیاسی سطح پر نہیں برتا جاتا بلکہ عورت کو عربی قواعد میں بھی کہتر حیثیت دی گئی ہے۔ اس طرح عربی گرامر بھی گویا مرد اساس نظام کی تشکیل کردہ ہے اور عورت کو 'ثانوی جنس' بنائے رکھنے کے لیے مرد معاشرہ ہر سطح پر متحرک ہے۔ ظاہر ہے کہ اس ناحیہ سے آج تک کسی نے نہیں سوچا اور نہ ہی اس طرف کسی نے دھیان دیا، یہ ایک متجسس ذہن کا کارنامہ ہے کہ اس نے اس طور و طرز پہ بھی سوچا اور عورتوں کے ساتھ برتے گئے تعصبات کی نشان دہی کی۔

کبیر الدین فوزان مفروضات اور موہوم تصورات کے اسیر نہیں ہیں، وہ بالکل نئے طور پر غیر روایتی طریق سے سوچتے ہیں، انسانی وحدت اور اجتماعیت کے تناظر میں غور و فکر کرتے ہیں۔ ان کی تحریریں پڑھ کر امام رازی، غزالی، ابن خلدون، ابن عربی، ابن تیمیہ، ابن رشد کی تصویریں سامنے

آجاتی ہیں۔ ان کی رایوں سے اختلاف کیا جاسکتا ہے اور کرنا بھی چاہیے مگر ان کے نیک جذبہ پہ شک نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے اپنے اجتہادی انکشافی تحریروں سے اسلام کی حرکی روح سے ملت اسلامیہ کو آشنا کرنے کی کوشش کی ہے، وہی حرکی روح جس سے مغربی دنیا خوف زدہ ہے۔
علامہ اقبال نے جس حقیقت کی طرف ان اشعار میں اشارہ کیا ہے، کبیر الدین فوزان نے بھی اس حقیقت کا سراغ پالیا ہے۔ اقبال ابلیس کی حکمت عملی کا انکشاف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

خیر اسی میں ہے، قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہان بے ثبات
ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات

کبیر الدین فوزان نے مسلمانوں کی اس ذہنی غلامی اور غنودگی کے خلاف قلمی جہاد چھیڑا ہے اور مسلمانوں کو زمانے کی بدلتی رفتار سے باخبر اور آشنا کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کو مژگاں کھول کر کائنات کے اسرار کی تفہیم کے لیے اکسایا ہے۔ انہیں خبر ہے کہ اس منجمد، مقلد معاشرہ میں کسی نئی بات کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے اور ذبابی ذہنوں میں تقلید اس قدر سرایت کرگئی ہے کہ تازہ ہواؤں کی شگفتگی ان کے حواس شامہ کو ناگوار گزرتی ہے، پھر بھی انہوں نے تاریکی کو روشن کرنے کی اپنی سی کوشش جاری رکھی ہے۔
کبیر الدین فوزان کی نئی فکری تشکیل اور مذہبی تعبیرات کے تشتت کو تطابق اور توافق میں تبدیل کرنے کا یہ علمی عمل مستحسن بھی ہے اور قابل تعریف بھی۔ علمی زوال کے اس دور میں ایسے صاحب کمال اب کہاں، اس لیے ہمیں اہل علم کی قدر کرنی چاہیے اور ان کے افکار ونظریات پر نہایت متانت اور تمکنت کے ساتھ غور کرنا چاہیے۔
پورنیہ ضلع کے گنڈ واس گاؤں کے کبیر الدین فوزان ہمارے عہد کے نابغہ روزگار، وحید العصر عالم ہیں۔ 'قافلہ' اور 'افکار' جیسے مجلّہ کی ادارت سے وابستہ فوزان کی تحریریں مستقبل کے لیے بھی مشعل راہ ہیں۔ ان کی تحریریں اردو کے علاوہ دیگر عالمی زبانوں میں ہوتیں تو وہ ارسطو اور افلاطون کے ہمرکاب ہوتے اور پوری دنیا ان کے علمی نکات پر عش عش کرتی...!

✪✪✪

Phone 0132-2653018

عـــ ۸۱ مورخہ ۵ ربیع الاول ۱۴۲۴ھ مطابق ۸، مئی ۲۰۰۳ء

OFFICE **MADRASA MAZAHIR ULOOM**

(WAQF) **SAHARANPUR**-247001(U.P.) INDIA

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم! امابعد

دین ومذہب کی تعلیمات اوراس کی نشرواشاعت نیز ملک وملت کی خدمت کیلئے ”تنظیم علماء حق“ ایک موقر تنظیم ہے، اس تنظیم کے اغراض ومقاصد میں نے ۸؍جنوری ۲۰۰۳ء کو دیکھے اوراس کی ترقی کے لئے مولانا مفتی خبیب رومی مفتی مظاہر علوم (وقف) سہارنپور دعا بھی کرائی، اس تنظیم کے کارگزار صدر مولانا محمد اعجاز عرفی القاسمی خلیفہ مجاز عارف باللہ حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحب مدظلہٗ ایک معتبر عالم دین ہونے کیساتھ مذہب وملت کے کاموں کا تجربہ بھی رکھتے ہیں ان کی نگرانی میں ”تنظیم علماء حق“ سرگرم ہے۔

میں تمام مسلمانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ اس تنظیم کی ہر طرح کی مالی اوراخلاقی امداد واعانت کی جائے۔

ان اللہ لایضیع اجر المحسنین

العبـــــــــد

مظفر حسین المظاہری

ناظم ومتولی مدرسہ مظاہر علوم (وقف) سہارنپور

Ref. No..............

Dated ۲۱ رجمادی الثانی ۱۴۲۶ھ

آل انڈیا تنظیم علماء حق نئی دہلی کے متعلق

بندہ جملہ حضرات سے درخواست کرتا ہے کہ سبھی
دینی شعبوں کی طرف توجہ کریں۔ اسمیں خصوصاً قیام مکاتب کی
طرف خاص طور پر توجہ کریں۔ کیونکہ ہمارا مسلم بچہ ابتدائی
سے مکاتب میں جانے کے بجائے اسکولوں میں جاکر اسکا
رخ بدل جاتا ہے۔ دین سے دور ہوجاتا ہے۔ اور
غلط چیزوں کی طرف راغب ہوکر اسلام سے بھی دور ہوتا چلا جاتا ہے
میں اصحاب خیر حضرات سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ دل کھول کر اہل مکاتب کی
اعانت کریں۔ آپکے لئے صدقہ جاریہ ہوگا۔ اور یہی بچے دین کے دیگر شعبوں
میں پہنچیں گے یعنی مدارس کے مدرس، مساجد کے امام خطیب اور خانقاہوں کے ذاکر
شاغل بنیں گے۔ اللہ تعالیٰ اخلاص کے ساتھ کارکنان کو کام کرنے کی توفیق
عطا فرمائے۔ اور معاونین کو اعانت کرنے اور امت کو بچے بھیجنے کی توفیق
عطا فرمائے۔

طلحہ کاندھلوی

حضرت مولانا محمد طلحہ صاحب
سرپرست مدرسہ

۲۳ جمادی الثانی ۱۴۳۲ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اما بعد

تنظیم علمائے حق نئی دہلی اسلام کی ترویج و اشاعت اور ملک و ملت کی خدمت کے لئے ایک موقر تنظیم ہے۔ مولانا محمد اعجاز عرفی قاسمی اس کے جنرل سکریٹری ہیں۔ موصوف تمام دینی جوش کے ساتھ ملک و ملت کی خدمت کا بھی تجربہ رکھتے ہیں۔ اس تنظیم کا مرکزی دفتر دہلی میں ہے لیکن اس کا دائرہ کار دہلی کے علاوہ بہار، بنگال، جھارکھنڈ و تریپورہ کے بیشتر قصبات تک وسیع ہے۔ اس تنظیم کے تحت ہوسٹل ۱۹ مدارس ہیں جن میں طلباء کی معیاری تعلیم کا نظم ہے۔ اور ۵۴ مکاتب قائم ہیں جن میں تحفیظ و تجوید کے علاوہ عصری تعلیم کا معقول انتظام ہے۔ میں تمام اہل خیر سے اپیل کرتا ہوں کہ اس تنظیم کی زیادہ سے زیادہ اعانت فرمائیں

[illegible] تھانوی

KHANQAH ASHRAFIA
THANA BHAWAN
☎ 01399-233343

حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب

تبلیغی مرکز حضرت نظام الدین ' نئی دهلی

مورخہ ۲۳ر دسمبر ۲۰۰۰ء کو آل انڈیا تنظیم علماء حق کے صدر دفتر بمقام بٹلہ ہاؤس جامعہ نگر دہلی حاضری ہوئی یہ تنظیم حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی کی قیادت وصدارت میں سرگرم عمل ہے تنظیم کے جنرل سکریٹری مولانا محمد اعجاز عرفی سے گفتگو کے درمیان تنظیم کی دینی، علمی اور دعوتی سرگرمیوں سے واقف ہوا ملک کے مشاہیر علماء حق کی تائید وحمایت اس تنظیم کو حاصل ہے۔ مختصر مدت میں تنظیم نے مدارس ومکاتب کے قیام اور اس کی نگرانی کے سلسلہ میں نمایاں خدمات انجام دیے ہیں۔ اس پر دل سے دعاء نکلتی ہے ملک کے مسلمانوں سے عموماً اور دعوت و تبلیغ سے جڑے ہوئے افراد واشخاص خصوصاً میری اپیل ہے کہ دل کھول کر اس تنظیم کی اعانت کریں۔ عند الله ماجو ہوں.

عبدالرحیم عفی عنہ
۲۳ر دسمبر ۲۰۰۰ء
بنگلہ والی مسجد تبلیغی مرکز
حضرت نظام الدین، نئی دہلی

Ameeduzzaman Qasmi Kairanvi

- Working President: Sout Ulaam Deoband Old Boys Organisation
- General Secretary: All India Muslim Majlis e Mushawarat
- Member: All India Muslim Personal law Board

عمید الزماں قاسمی کیرانوی

- کارگزار صدر ... دارالعلوم دیوبند
- جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت
- رکن آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

Ref No

Date ٣٠/١٠/٦

إلى من يهمه الأمر

إن "تنظيم علماء الحق لعموم الهند" منظمة فنية أنشئت قبل بضع سنوات لخدمة الاسلام ومسلمي الهند وإقامة الانسجام الطائفي بين أبناء الوطن. ومن أهداف المنظمة العمل على تصحيح عقيدة المسلمين ومحاربة البدع والخرافات والتقاليد الجاهلية السائدة بينهم، وإصلاحهم الاجتماعي عن طريق تزويدهم بالتعليمات الاسلامية الصافية السمحاء، ونشر التعليم الديني بين أولادهم والاهتمام بتربيتهم الاسلامية، فتنشئ لذلك كتاتيب يتعلم فيها التلاميذ القرآن الكريم تلاوة وتجويدا واستحفاظا، ومدارس لتدريس العلوم الاسلامية إلى جانب اللغة العربية. وقد تناهى إلى علمنا - عن طريق شهادات كبار علماء المسلمين في الهند - أن هناك عددا كبيرا من مثل هذه الكتاتيب والمدارس الدينية التي تديرها المنظمة في مختلف أنحاء الهند.

ويرأس هذه المنظمة التي تتخذ من نيو دلهي مقرا رئيسيا لعملها سماحة الشيخ الجليل محمد سالم القاسمي رئيس الجامعة الاسلامية دار العلوم (وقف) ديوبند. كما يتولى منصب أمينها العام فضيلة الأستاذ إعجاز عرفي أحد كبار رجال الدين الشبان المعروفين في الأوساط الدينية في الهند. وهو الروح الرئابة لهذه المنظمة، فيعمل جاهدا لتحقيق أهدافها.

وأتمنى للداعية الاسلامي الاستاذ إعجاز عرفي ومنظمته وسائر نشاطاته الدينية الإصلاحية التوفيق والنجاح، وأناشد أصحاب الخير أن يمدوا اليه يد العون والمساعدة، حتى يمكنه مواصلة عمله التربوي الدعوي البناء. إن الله لا يضيع أجر المحسنين. وهو المستعان والموفق لكل خير.

عميد الزمان القاسمي الكيرانوي

395-A/3 Model Islamic Public School Building, Zakir Nagar New Delhi-110025 Tel. 26983317 26982576 Mob 9891191499
E-mail-ameeduzzamankairanvi@yahoo.com

A-30/1, Tikona Park, Jamia Nagar
NEW DELHI 110025 (INDIA)
Tel : (011) 6916383

الأستاذ الدكتور محمد اجتباء الندوي
Prof.Dr.M.IJTEBA NADWI

إلى من يهمه الأمر

يسرني بأن «منظمة علماء الحق لعموم الهند» برأسها فضيلة
الشيخ محمد سالم القاسمي نجل سماحة الشيخ المقرئ محمد طيب القاسمي رحمه الله
رئيس جامعة دار العلوم بديوبند السابق، وأمينها العالم الشيخ
محمد إعجاز العرفي القاسمي، من الدعاة النشيطين في حقل التعليم
والتربية والدعوة، وبخاصة في غير المسلمين، وفي أوساط المتغربين
الخرافيين الذين يشوهون صورة الإسلام السليمة النقية الطاهرة
وللمنظمة فروع عديدة في ربوع الهند تقوم ببث هذه المبادئ
الإسلامية الخيرة، ونشر الوعي الفكري واليقظة في المجتمع
الهندي عامة، وللمنظمة مقر دائم في العاصمة دهلي، ليعقد فيه
اجتماعات ومجالس للعلم والدين والدعوة، هكذا أخبرنا
الشيخ محمد إعجاز العرفي الأمين العام للمنظمة، والرجاء بأن المنظمة
ستلفت أنظار رجال الخير والمحسنين لشد أزرها ومؤازرتها
وما شهدنا إلا بما علمنا،

والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته

المخلص

محمد اجتباء الندوي

الحائز على الجائزة التقديرية من قبل رئيس جمهورية الهند، رئيس المركز العلمي، دلهي الجديدة - الهند، رئيس قسم اللغة العربية في الجامعة الملية الإسلامية بدهلي ورئيس قسم اللغة العربية بجامعة كشمير في سري نغر، ورئيس قسم اللغة العربية والفارسية بجامعة إله آباد سابقا، وأستاذ مشارك في جامعة الإمام محمد بن سعود الإسلامية بالرياض، والجامعة الإسلامية بالمدينة المنورة سابقا، وعضو المجلس التنفيذي لندوة العلماء بلكناؤ، وعضو المجمع العلمي الإسلامي بلكناؤ، وعضو مجلس الدراسات العليا في كل من جامعة عليكره الإسلامية وجامعة إله آباد، وجامعة كشمير والجامعة الملية الإسلامية بدهلي

أي ١/٣٠ تكونه بارك، جامعة نگر، دلهي الجديدة ١١٠٠٢٥ (الهند) الهاتف ٦٩١٦٣٨٣ (٠١١)

بسم الله الرحمن الرحيم

جامعة رياض العلوم
٤٠٨٥- اردو بازار جامع مسجد
دلهي ١١٠٠٠٦ (الهند)

✆ 23264174, 23287489
JAMIA RIYAZUL ULOOM
4085, Urdu Bazar, Jama Masjid
Delhi-110006 (India)

الرقم: ....

التاريخ: ٤/٣/٢٠٠٨

لمن يهمه الأمر

الحمد لله وحده والصلاة والسلام على من لانبي بعده

وبعد

فان ادارة جامعة رياض العلوم بدلهي قد اطلعت على نشاطات " مؤسسة تنظيم علماء حق " ذاكر نغر بنيو دلهي الهند بواسطة النشرات لصادرة منها وتزكيات المشائخ المعروفين لدى الجمهور،

بعد دراسة خططها ومناهجها ترى ادارة الجامعة بانها نشاط جيد ونافع لرفع مستوى المجتمع في البلاد. حيث انها تدير تسعة عشر مدارس وجامعات وخمسة واربعين مكاتب في ولايات بيهار وبنغال وجهاركند واترابراديش، وهذه المدارس والمكاتب تقوم بتعليم وتربية ابناء المسلمين .

لذا تزكى ادارة الجامعة هذه المؤسسة الاسلامية والقائمين عليها بالثقة والامانة وترجو لها كل التقدم في النشاطات المخططة.

وصلى الله وسلم على نبينا محمد وعلى آله وصحبه اجمعين

الداعي الى الخير خادم الكتاب والسنة

(عبد المرشيد بن عبد السلام البستوى)

مدير جامعة رياض العلوم بدلهي

ورئيس تحرير مجلة الاسلام الشهرية بدلهي

ورئيس مجلس القضاء الاسلامي بدلهي

FURKAN ANSARI
Member of Parliament
(Lok Sabha)
Member :
- Standing Committee, Labour
- Consultative Committee, Railway
Permanent Special Invitee :
- Consultative Committee, Coal

8 10, North Avenue,
New Delhi - 110001
Phone : 011-23093503
Mobile 9868180491

Date 8/01/05

To Whom It May Concern

This is to certify that Tanzeem Ulama-e-Haq is rendering its yeoman services in the fields of dissemination of religious education and Islamic teachings. Besides it gives its services extraordinare for the progress of the beloved motherland, the humanity and the millat. It is also engaged in general welfare activities.

Maulana Mohd. Ajaz Urfi, its General Secretary is a virtuous man with a deep-rooted ambition to serve the mankind. The organisation is working under the superb guidance and patronage of Maulana Salim Qasimi Saheb. I have gone through the aims and objects of the organisation. I feel the endeavours made by Tanzeem Ulama-e-Haq are the need of the hour.

I, earnestly, appeal to all the generous people to extend their wholehearted moral and fiscal support to the organisation, in every possible way.

(Furqan Ansari)
Member of Parliament

تنظیم علماء حق
کے
اغراض ومقاصد

قرآن کریم کی ترتیل وتجوید کے ساتھ تعلیم اوراحادیث نبوی کی ترویج واشاعت۔

اہل سنت والجماعت کے فکر کی بنیاد پر صحیح اسلامی عقائد کا فروغ۔

جدید تقاضوں کے پیش نظر دینی مدارس، علمی مراکز اور عصری مکاتب کا قیام۔

مسلمانوں میں اعمال صالحہ، اخلاق حسنہ کی تعلیم وتربیت۔

اورغیراسلامی رسومات وخرافات کی اصلاح کیلئے جدوجہد۔

باطل تحریکات کے افکاروخیالات کی واضح تردید۔

اکابراہل حق کے فکروعمل کی ترویج واشاعت۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے علوم معارف کو عام کرنا۔

دینی مدارس اورملی جامعات پرآنے والی آفتوں کا دفاع اورانکا تحفظ۔

ضرورت مند علماء اورنادارطلبا کی کفالت اوران کے لئے وظائف کا انتظام۔

یتیموں، بیواؤں اورمختلف آفات سے متاثرلوگوں کی اخلاقی ومالی مدد۔

منصف مزاج برادران وطن سے رابطہ اورملک کے مختلف فرقوں کے درمیان اتفاق ویک جہتی کی کوشش۔

ALL INDIA TANZEEM ULAMA-E-HAQ

Q-25, Alsamad Road, Batla House, Jamia Nagar, New Delhi-110025

Telefax : 011-26985943

A/c No. : 5337, Jamia Cooperative Bank